*

1

تذکرہ و تبصرہ

''تو موجِ دُود سے صد آفتاب ابھریں گے!''

حافظ عاکف سعید' امیر تنظیم اسلامی

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے خلاف جس حکومتی آپریشن کا آغاز گزشتہ ہفتے ہوا تھا' اب وہ اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ ''آپریشن سائلنس'' کے نام سے حکومت نے ظلم و بربریت کا جو مظاہرہ کیا اور اُس کے نتیجے میں مولانا عبدالرشید غازی اور مدرسہ کے سینکڑوں طلبہ وطالبات کی جو شہادتیں ہوئی ہیں' اُس پر ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل افسردہ ہے۔ عام تأثر یہ ہے کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو ''فتح'' کر کے جنرل پرویز مشرف نے جہاں کارگل میں ہونے والی شکست کا داغ دھونے کی کوشش کی ہے وہاں اِس آپریشن کا اصل مقصد اور مدعا اپنے مائی باپ امریکہ کو خوش کرنا اور اپنے اقتدار کے تحفظ اور تسلسل کے لیے امریکی حمایت حاصل کرنا تھا۔ اگر یہ بات پیش نظر نہ ہوتی تو مسئلہ پرامن طریقے سے حل کیا جاتا۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا' بلکہ جان بوجھ کر کوشش کی گئی کہ مسئلہ پرامن طور سے حل نہ ہو۔ اِس سلسلے میں حکومتی بدنیتی کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ چنانچہ جب بھی مسئلہ کے حل کے لیے مذاکرات ہوئے اور اُن میں مثبت پیش رفت کے آثار ظاہر ہوئے تو کوئی ''نادیدہ ہاتھ'' انہیں سبوتاژ کرتا رہا۔ اِن مذاکرات میں جو باتیں طے ہوتی تھیں انتظامیہ اُن پر عمل درآمد میں رکاوٹ بن جاتی رہی۔ اور کون نہیں جانتا کہ انتظامیہ کی ڈور فردِ واحد کے ہاتھ میں ہے' یعنی جنرل پرویز مشرف' اور چونکہ وہ خونریزی کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے' لہٰذا مذاکرات کامیاب نہیں ہوئے۔

آخری شب بھی مولانا عبدالرشید غازی کے ساتھ چودھری شجاعت حسین اور علماء کے جو مذاکرات ہوئے' اُن میں بھی فریقین کا ایک پُرامن حل پر اتفاق ہو گیا تھا' مگر ایوان صدر ایک مرتبہ پھر اس حل کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ صدر نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر کے اِس حل کو reject کر دیا۔ قوم یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ اگر جنرل پرویز مشرف اپنی ہی حکومت کے نمائندوں کے طے کردہ مصالحتی فارمولے کو ماننے کو تیار نہ تھے تو پھر مذاکرات کیوں کیے جا رہے تھے؟ پھر تو ان کا مقصد سوائے پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے اور کچھ نہ تھا! چنانچہ صدر پرویز کا یہ کہنا کہ مذاکرات عسکریت پسندوں کی وجہ سے ناکام ہوئے' سفید جھوٹ

ہے۔ اِسی جھوٹ کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ انہوں نے سانحے میں ۳۷ افراد کے جاں بحق ہونے کا اعتراف کیا ہے' جب کہ دیگر سرکاری اعداد و شمار بھی اس سے کہیں زیادہ کی بات کرتے ہیں۔ غیر جانب دار آزاد ذرائع کی اطلاعات کے مطابق شہید ہونے والوں کی تعداد کم و بیش ایک ہزار بلکہ اس سے بھی متجاوز ہے۔ اِس پر مستزاد وہ سینکڑوں طلبہ و طالبات ہیں جو ابھی تک لاپتا ہیں اور اُن کے والدین سخت پریشان اور شدید ذہنی اذیت سے دوچار ہیں' وہ حکومت سے التجا کر رہے ہیں کہ خدارا! ہمیں یہی بتا دو کہ ہمارا بچہ یا بچی شہید ہو گیا ہے یا قید میں ہے۔ لیکن حکومت کو کیا پرواہ ہے۔ آپریشن سائلنس کے دوران میڈیا کو بھی کوریج سے شاید اِسی لیے روکا گیا' تاکہ حقائق سامنے نہ آ سکیں' کتنے لوگ جان بحق ہوئے' کتنے زخمی ہوئے اور کتنے لاپتا' قوم کو معلوم ہی نہ ہو سکے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ حکمرانوں نے جس ''آقا'' کو خوش کرنے کے لیے سینکڑوں معصوم جانوں کو بے رحمانہ طور پر گولیوں سے بھونا ہے' وہ تو اب بھی خوش نہیں ہوا اور نہ کبھی خوش ہو سکے گا۔ امریکہ نے جنرل صاحب کو 'شاباش' تو دی ہے' مگر اُس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ آپریشن کافی نہیں ہے' ہمارے اصل دشمن قبائلی علاقوں میں چھپے ہیں' اُن کے خلاف بھی بھرپور آپریشن کرو' بلکہ ہم براہِ راست حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ گویا امریکہ کی طرف سے خطرے کی تلوار بدستور ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے' اور یہ سلسلہ ابھی اور آگے بڑھے گا۔ ؎

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دست قاتل میں ہیں

لال مسجد والوں کا ''جرم'' یہی تو تھا کہ انہوں نے نفاذِ شریعت کا مطالبہ کیا' شریعت یا شہادت کا نعرہ لگایا' اور پھر شریعت کی خاطر جان دے دی۔ انہوں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا' کسی کی عزت و آبرو پر حملہ نہیں کیا تھا۔ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی ضرور کی لیکن زیادہ تر سمجھانے بجھانے پر اکتفا کیا۔ تمام علماء نے ان کے مطالبات کو درست اور جائز قرار دیا' ہاں طریق کار سے اتفاق نہیں کیا—— لیکن سوال یہ ہے کہ جب مطالبات درست تھے اور یہ پوری قوم کی آواز تھی تو پھر نفاذِ شریعت کے مطالبے کو کیوں نہیں مانا گیا؟ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں ایک محدود سیکولر اقلیت شریعت نہیں چاہتی اور یہ لوگ یہاں ایسا معاشرہ چاہتے ہیں

(باقی صفحہ 88 پر)

*

بقیہ : تذکرہ وتبصرہ

کہ جہاں شراب خانے عام ہوں، فحاشی وعریانی کی ترویج ہو، آزادانہ جنسی اختلاط کا کلچر پنپے، مگر بحیثیت مجموعی قوم کی غالب اکثریت کا موقف تو یہی ہے کہ یہاں نظامِ شریعت نافذ ہو۔ ایک امریکی ادارے ورلڈ پبلک اوپینین کے تازہ سروے کے مطابق پاکستان میں ۷۹ فیصد لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسائل کا حل اسلامی شریعت کا نفاذ ہے اور ہم اسلامی شریعت چاہتے ہیں۔ لہٰذا لال مسجد کے نفاذِ شریعت کے مطالبہ کو تسلیم کیا جانا چاہیے تھا۔ لال مسجد والوں کو طاقت سے دبانے کی بجائے اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کی جانی چاہیے تھی۔

حکومت کے ایوانوں سے اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والے ''انتہا پسند اور دہشت گرد'' قرار دیے گئے، مگر حکمرانوں کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اُن کے ''فتوے'' سے حقائق نہیں بدلتے۔ درحقیقت انتہا پسند اور دہشت گرد وہ نہیں جو اسلام کا مطالبہ کرتے ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو اِس جائز بلکہ واجب مطالبے کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں، جو ہر حال میں اِس گلے سڑے اور بوسیدہ استحصالی نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ اُن کی مراعات اور عیاشیاں جاری رہیں اور اہل پاکستان پر مسلط تاریک رات کا خاتمہ نہ ہونے پائے۔

اگر حکومت کسی طور سے یہ مطالبہ ماننے پر تیار نہ بھی تھی تو بھی معاملے کو روزِ اوّل ہی سے پرامن طور پر حل کیا جانا چاہیے تھا۔ حکومت نے دیدہ ودانستہ اِس میں کوتاہی کیوں کی اور معاملے کو طول کیوں دیا گیا؟ یہ معاملہ جنوری میں شروع ہوا تھا، جب حکومت بعض مساجد کو گرا رہی تھی اور بعض کو نوٹس جاری کیے جا رہے تھے۔ اِس کے ردّعمل میں لال مسجد انتظامیہ گرائی گئی مساجد کی تعمیر اور نفاذِ شریعت کا مطالبہ لے کر کھڑی ہوگئی، مگر حکومت نے اُن کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ جب انہیں اندازہ ہوا کہ حکومت مساجد کی تعمیر اور شریعت کے نفاذ میں سنجیدہ نہیں تو چند ماہ گزرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہم خود منکرات کا خاتمہ کریں گے۔ اور اِس میں بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ انہوں نے کسی کو ظلم وستم کا نشانہ نہیں بنایا، اگر کسی کو پکڑ کر لائے بھی تو سمجھا بجھا کر چھوڑ دیا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس دوران جب بھی مذاکرات ہوئے انہوں نے لچک کا مظاہرہ کیا۔ اگر حکومت گرائی گئی مساجد کو تعمیر کر دیتی تو بھی معاملہ بآسانی حل ہوسکتا تھا، مگر افسوس کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر یہ امر بھی ناقابل تردید ہے کہ اگر لال مسجد کے طلبہ وطالبات ویڈیو سنٹروں پر گئے، وہاں سی ڈیز جلائیں، چینی خواتین کو پکڑ لائے تو انہیں فری ہینڈ بھی تو حکومت ہی نے دیا، ورنہ حکومت اگر چاہتی تو مدرسہ کی ناکہ بندی کر کے بھی طلبہ کو ایسا کرنے سے روک سکتی تھی۔ حکومت نے خود اُن کو مواقع فراہم کیے، اُن کی راہ میں کہیں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ پھر اصل مجرم تو حکمران ہیں کہ جنہوں نے معاملے کو اِس حد تک آگے بڑھایا۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ

حتمی آپریشن سے قبل چھیڑ چھاڑ لال مسجد کے طلبہ نے کی تھی' حالانکہ انہوں نے واضح طور پر اس کی تردید کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اقدام ہم نے نہیں کیا بلکہ ریجرز نے کیا ہے۔ اور اس سارے پس منظر میں یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ جو لوگ حکومت کے بارے میں یہ سوءِ ظن رکھتے ہیں کہ اس آخری آپریشن کے لیے جو وقت منتخب کیا گیا ہے اس سے دراصل اے پی سی کی طرف سے توجہ ہٹا کر اسے ناکام بنانا حکومت کے پیش نظر تھا' وہ بلاجواز نہیں!

اگر غور سے دیکھا جائے تو اِس معاملے کی بہت حد تک مشابہت ہمیں واقعہ کربلا سے نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نواسۂ رسول ﷺ کی بلند مرتبہ ہستی سے کسی کا تقابل نہیں کیا جا سکتا' مگر ہم تقابل نہیں کر رہے' بلکہ صورت حال کی اُس مشابہت کو بیان کر رہے ہیں جو کئی اعتبارات سے اُس واقعے کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

مثال کے طور پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی خلافت کے حوالے سے یہ دیکھتے ہوئے اختلاف کیا کہ یہ تقرر مسلمانوں کے مشورے سے نہیں ہوا' بلکہ بیٹے کی نامزدگی میں ملوکیت کا شائبہ نظر آتا ہے' جبکہ آئیڈیل اسلامی خلافت کا تقاضا شورائیت تھا۔ اگرچہ اُس وقت باقی نظامِ شریعت کا پورا ڈھانچہ حسب سابق چلا آ رہا تھا' لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ اِس ایک خرابی کے خلاف اُٹھے' تاکہ بروقت اس کا ازالہ کیا جائے' کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ اگر اس وقت اِس کو دور نہ کیا گیا تو اِس کے بعد سیاسی نظام میں اور بہت سی خرابیاں جنم لیں گی۔ جبکہ آج صورت حال یہ ہے کہ حکومت کی سطح پر دین کی جڑیں کھودی جا رہی ہیں اور منکرات کا سیلاب ہے کہ جس کا ریلا حکومتی سرپرستی میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لال مسجد انتظامیہ نے فحاشی و عریانی کے اِس سیلاب اور منکرات کے خلاف آواز بلند کی اور اُن کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔

حضرت حسینؓ کو اہل کوفہ نے بوریاں بھر بھر کر بیعت نامے بھیجے تھے کہ ہم آپ کو خلیفہ مانتے ہیں' آپ آئیے اور اِس منکر کے خلاف جہاد کیجیے' ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی۔ لال مسجد انتظامیہ نے نفاذِ شریعت کا مطالبہ کیا تو بہت سے لوگوں نے انہیں اپنے تعاون کا یقین دلایا' انہیں خطوط لکھے کہ آپ آگے بڑھیے' ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ اس چیز نے انہیں مزید حوصلہ دیا اور وہ اپنے مطالبات پر ڈٹ گئے' ورنہ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ لال مسجد انتظامیہ کی اپنی کوئی جماعت نہ تھی جس کے سہارے انہوں نے اقدام کیا' بلکہ عقیدت مندوں کا ایک حلقہ تھا جو مسجد کے نمازیوں پر مشتمل تھا۔

ایک اور مشابہت یہ بھی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کوفہ جا رہے تھے تو انہیں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ کہہ کر روکا تھا کہ آپ جن لوگوں پر بھروسہ کر کے جا رہے ہیں وہ عہد پورا نہیں کریں گے۔ اب ظاہر ہے جو صحابہؓ آپؓ کو رکنے کا مشورہ دے رہے تھے اُن کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ (معاذ اللہ) وہ مخلص نہیں تھے' بلکہ وہ ''situation'' کو دیکھ رہے تھے۔ یہاں بھی بہت سے علماء

*

نے جن کا خلوص و اخلاص بالائے شک ہے' دونوں بھائیوں کو سمجھانے اور حکومت کے خلاف قدم اٹھانے سے روکنے کی کوشش کی لیکن دونوں بھائی اسی خیال میں رہے کہ حکومت کے خلاف تحریک میں بہت سے لوگ ہمارا ساتھ دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے' اور اگر ہمارے خلاف آپریشن کیا گیا تو پورے پاکستان میں آگ لگ جائے گی' قبائلی علاقوں اور دیر' سوات اور کوہستان وغیرہ سے لوگ مدد کے لیے آئیں گے' اور پھر حکومت کو ہمارے خلاف آپریشن روکنا پڑے گا۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جب اندازہ ہوا کہ کوفیوں نے بے وفائی کی' اور وہ اپنی بیعت سے منحرف ہو گئے تو انہوں نے یزید کے لشکر کے سامنے تین آپشنز پیش کیے۔ ایک یہ کہ میری یزید سے براہِ راست ملاقات کرائی جائے۔ دوسرے یہ کہ میں جہاں سے آیا ہوں مجھے وہیں واپس جانے دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ آپ مجھے موقع دیں کہ سرحدوں پر جا کر جہاد کروں اور شہادت پاؤں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب مولانا عبدالرشید غازی کو اندازہ ہوا کہ صورت حال ہماری توقعات کے خلاف ہے' ہماری تحریک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے گی' تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنے مطالبات سے دست بردار ہوتے ہیں' آپ ہمیں محفوظ راستہ دے دیں۔ اور یہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا' بلکہ طلبہ و طالبات کی جانیں بچانے کی غرض سے کیا تھا۔

جیسے کل یزید کے لشکر نے حضرت حسینؓ کی کوئی بات نہیں مانی تھی' آج اِس حکومت نے بھی مولانا عبدالرشید کی بات نہیں مانی۔ صاف کہہ دیا گیا کہ محفوظ راستہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گویا اب جبکہ تم ہمارے شکنجے میں آ گئے ہو' تو ہم تمہیں ختم کر کے امریکی ایوانوں میں اپنے نمبر سکور کریں گے۔ چنانچہ جو سلوک حضرت حسینؓ اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ یزید کی فوج نے کیا وہی سلوک مولانا عبدالرشید غازی' اُن کے ساتھیوں اور طلبہ و طالبات کے ساتھ موجودہ حکمرانوں نے کیا' اور اِس طرح انہوں نے یزیدیت کی یاد تازہ کر دی۔

اب سوال یہ ہے کہ لال مسجد انتظامیہ سے طریقہ کار کے ضمن میں کیا غلطی ہوئی ہے؟ دیکھئے' قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عمومی طور پر پوری اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے' اور وہ لوگ جنہیں اقتدار حاصل ہو' اُن کے تو اوّلین فرائض میں شامل ہے۔ پھر یہ کہ علماء وصوفیاء کی بھی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ منکرات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھیں' وعظ ونصیحت اور تبلیغ دین کے ذریعے عوام میں منکرات کے خلاف نفرت اور دینی حمیت پیدا کریں۔ ایسی فضا بنائیں کہ عوام برائیوں اور منکرات کے خلاف ہو جائیں اور حکمرانوں کو جرأت نہ ہو کہ منکرات کو فروغ دے سکیں۔

نہی عن المنکر کا سب سے اونچا درجہ برائی کو قوت کے ساتھ روکنا ہے۔ اگر طاقت نہیں تو پھر زبان سے روکنا چاہیے اور اگر اِس کی بھی طاقت نہیں تو پھر دل میں برائی سے نفرت ضرور ہونی چاہیے' کہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اب چونکہ طاقت اور قوت حکمرانوں کے پاس ہوتی ہے' لہٰذا منکرات کو قوت سے روکنے کی سب سے پہلے ذمہ داری حکمرانوں کی ہے۔ علماء کا کام یہ ہوگا کہ زبان سے اُن

منکرات کے خلاف آواز اٹھائیں‘ لیکن اگر حکومت اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہی‘ اور منکرات کے خاتمے کی بجائے انہیں فروغ دی رہی ہے‘ تو پھر علماء وعوام کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ قوت کے ساتھ منکرات کا خاتمہ کریں۔ لیکن اِس کی صورت یہ نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ کھڑا ہو جائے اور توڑ پھوڑ شروع کر دے‘ کیونکہ اِس سے انتشار پیدا ہوگا۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ اصحابِ علم ودانش پہلے قوت حاصل کریں‘ جس کا طریقہ سیرت النبی ﷺ سے ہمیں ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک انقلابی جماعت یعنی ''حزب اللہ'' بنائی جائے‘ اُس کے افراد کو تزکیہ وتربیت کے مراحل سے گزارا جائے‘ اور جب تربیت یافتہ افراد کی جماعت اتنی قوت پکڑ لے کہ بظاہر حالات یہ یقین واثق ہو کہ حکومت سے دوبدو مقابلے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی تو پھر اقدام کیا جائے گا۔ اور یہ اقدام جائز ہوگا‘ جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ فاسق و فاجر مسلمان حکمران کے خلاف بھی ان شرائط کے ساتھ مسلح بغاوت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر قوت حاصل کیے اور تیاری کیے بغیر آپ اُٹھیں گے تو اگرچہ اپنے خلوص سے کی جانے والی جدوجہد کا اللہ کے ہاں اجر پالیں گے‘ مگر دنیا میں آپ کی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکے گی۔

اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہر طرف منکرات پھیل رہے ہیں اور حکومت اُن کی سرپرستی کر رہی ہے اور یہ صورت حال نبی اکرم ﷺ کی پیشینگوئی کے عین مطابق ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم منکرات کا حکم دو گے اور معروف سے روکو گے۔ آپؐ کی اس بات پر آپؐ کے صحابہؓ حیران ہو گئے تھے‘ مگر آج آپ دیکھیں کہ یہی ہو رہا ہے۔ حکمران پوری ریاستی قوت کے ساتھ منکرات کو عام کر رہے ہیں۔ کھلے عام برائیوں کی ترویج کی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میراتھن ریس ہو کر رہے گی اور اس میں نیم برہنہ حالت میں خواتین بھی حصہ لیں گی خواہ پوری قوم اِس کی مخالفت کیوں نہ کرے‘ خواہ کاروبارِ زندگی ٹھپ ہو جائے۔ اِسی طرح کا معاملہ ''تحفظ حقوقِ نسواں بل'' کی منظوری کا ہے۔ اِس بل کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے ہر قسم کی مسلکی اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر یہ قرار دیا کہ یہ غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے‘ مگر حکومت اسے اسلامی قرار دیتی رہی‘ اور اپنی قوت کے بل بوتے پر اُسے اسمبلی سے منظور کروا کر قانون بنا دیا۔ جب ایسی صورت حال ہو کہ منکرات کو معروفات کا نام دے کر رائج کیا جا رہا ہو‘ تو پھر مسلمان حکمرانوں کے خلاف امام ابوحنیفہؒ کی معین کردہ شرائط کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو مسلح بغاوت بھی جائز ہو جاتی ہے (اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں اِس کا مفید اور بہترین متبادل ملک گیر انقلابی جماعت کی پرامن احتجاجی تحریک اور مظاہرے ہیں‘ جس کے ضمن میں تفصیلی گفتگو آئندہ نشست میں ہوگی)‘ مگر اِس کے لیے ضرورت کے مطابق تیاری اور قوت کا ہونا ضروری ہے‘ تاکہ مثبت انداز میں نفاذِ شریعت کا مشن آگے بڑھ سکے۔ اگر طاقت اور تیاری کے بغیر اقدام کیا گیا تو پھر کربلا کی تاریخ دہرائی جاتی رہے گی جیسا کہ لال مسجد میں دہرائی گئی ہے اور یہ تحریک نتیجہ خیز نہیں ہو سکی۔ یہ اور بات ہے کہ جو لوگ خلوص واخلاص سے لال مسجد کی تحریک میں

*

شامل ہوئے' اُن کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے ذاتی اقتدار کے لیے کوشاں نہ تھے' بلکہ اُن کا مطالبہ اسلامی نظام کا نفاذ تھا' لہٰذا اُن کی جدوجہد اور اُس کے اجر وثواب کو اللہ تعالیٰ ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ لال مسجد انتظامیہ نے 'شریعت یا شہادت' کا نعرہ لگایا' اور یہی دو چیزیں فرعونِ وقت امریکہ کو ''برائی'' دکھائی دیتی ہیں۔ وہ انہیں کسی صورت گوارا کرنے کو تیار نہیں' اِس لیے کہ نظامِ شریعت کے آنے سے ظالمانہ استحصالی نظاموں کے لیے جگہ نہ رہے گی۔ چنانچہ جس طرح کل کا فرعون اپنے اقتدار اور نظام کے لیے ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیتا تھا' آج کا فرعون امریکہ اور اُس کے حلیف مسلمان حکمران بھی اسلامی نظام کی تحریک اور جذبۂ جہاد کو مکمل طور پر کچل دینا چاہتے ہیں۔ اسلام آباد میں ہونے والی خونریزی اُس کی تازہ مثال ہے۔ لیکن ہم حکمرانوں پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جبر وتشدد اور ظلم وبربریت کے ذریعے حق کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا۔ آپ اِسے جتنا دبائیں گے یہ اُسی قدر قوت سے اُبھرے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ آپ کے عمل سے ردِّعمل زیادہ سخت ہوگا: ؎

گر اک چراغِ حقیقت کو گل کیا تم نے
تو موجِ دود سے صد آفتاب ابھریں گے

لال مسجد انتظامیہ نے علماء پر بھی اتمامِ حجت کر دیا ہے۔ اگر علمائے کرام نے اُن کے طریقۂ کار سے اختلاف کیا ہے تو بجا طور پر کیا ہے' لیکن اُن پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ صحیح طریقۂ کار کے لیے قوم کی رہنمائی کریں' اور پھر اُس طریق پر چلتے ہوئے اسلامی نظام کے قیام کے لیے قدم بڑھائیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علمائے کرام' عوام اور ہم سب کو نظامِ اسلامی کے غلبے کے لیے جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے اور اِس مملکت خداداد پاکستان کو شریعت کا گہوارہ بنائے۔ (آمین)

بقیہ حواشی: حکمرانوں کے خلاف خروج کا مسئلہ

وترك.....

(٥) صحيح مسلم: ٣٤٤٨۔ (٦) تفسير فى ظلال القرآن' ج٣' ص ١٥٤٣۔
(٧) قواعد الاحكام' ج٢' ص ٥۔ (٨) مجموع فتاوىٰ ابن تيميه' ج٢٨' ص ٢٥٩۔
(٩) اخرجه الطبرانى' السلسلة الصحيحة: ٤٥٧۔ (١٠) اخرجه ابن حبان' السلسلة الصحيحة: ٣٦٠۔
(١١) سنن الترمذى: ١٨٤٣۔ (١٢) اخرجه الطبرانى' صحيح الجامع: ٣٦٦١۔
(١٣) اخرجه ابوداؤد واحمد وغيرهما' السلسلة الصحيحة: ٣٧١۔
(١٤) السلسلة الصحيحة: ٢٩٨٨۔ (١٥) اخرجه الطبرانى' السلسلة الصحيحة: ٢٦٦٣۔
(١٦) سنن ابى داؤد' كتاب البيوع' باب فى النهى عن العينة۔
(١٧) سنن ابى داؤد' كتاب الجهاد' باب كراهية ترك الغزو۔
(١٨) اخرجه ابوداؤد وغيره' السلسلة الصحيحة: ٩٥٨۔

(باقی صفحہ 92 پر)

*

1

سیرت النبی ﷺ

سلسلۂ تقاریر ⑥

خلافتِ فاروقیؓ وعثمانیؓ

اور

انقلابِ نبویؐ کی توسیع

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۛ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۟ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾﴾ (الفتح)

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی

ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ
شَیۡئًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ (النور) صدق اللّٰہ العظیم

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَیَسِّرۡلِیۡ اَمۡرِیۡ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ
اَللّٰهُمَّ اَلۡهِمۡنِیۡ رُشۡدِیۡ وَاَعِذۡنِیۡ مِنۡ شُرُوۡرِ نَفۡسِیۡ۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الۡحَقَّ حَقًّا وَّارۡزُقۡنَا اتِّبَاعَهٗ
وَاَرِنَا الۡبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارۡزُقۡنَا اجۡتِنَابَهٗ ...... آمین یَاربَّ الۡعَالَمِیۡنَ!

مَیں اپنے دروس و خطابات کا آغاز بالعموم ان دعاؤں سے کیا کرتا ہوں۔ یہ دونوں دعائیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ بیان کرنے والا اپنے حق میں بھی دعا کرے اور سامعین کے حق میں بھی دعا کرے: اَللّٰهُمَّ اَلۡهِمۡنِیۡ رُشۡدِیۡ ''اے اللہ! میرے دل میں وہی بات ڈال جو حق ہو' درست ہو' صحیح ہو''۔ وَاَعِذۡنِیۡ مِنۡ شُرُوۡرِ نَفۡسِیۡ ''اور مجھے میرے نفس کی شرارتوں سے اپنی پناہ میں لے لے''۔ کہیں کوئی نفسانیت' کوئی عصبیتِ جاہلیہ' کوئی تعصّب' کوئی گروہی یا طبقاتی یا فرقہ وارانہ ضد اور ہٹ دھرمی میرے نقطۂ نظر اور میری رائے کو کج نہ کردے۔ دوسری دعا ہے: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الۡحَقَّ حَقًّا وَّارۡزُقۡنَا اتِّبَاعَهٗ ''اے پروردگار! ہمیں حق کو حق دکھا (ہم حق کو حق ہی دیکھیں' حق کو حق ہی سمجھیں) اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق عطا فرما''۔ اس میں اوّلاً حق کی پہچان اور ثانیاً اس کی اتباع کی توفیق کے لیے دعا کی گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں مرحلے کٹھن ہیں۔ حق کے پہچاننے کے لیے بہرحال کچھ شرائط ہیں' جن میں خلوصِ نیت کو اوّلیت حاصل ہے' لیکن حق کا پہچاننا جتنا مشکل ہے' پہچاننے کے بعد اس کو قبول اور اختیار کر لینا اس سے بدرجہا مشکل ہے۔ وَاَرِنَا الۡبَاطِلَ بَاطِلًا ''اور ہمیں باطل کو باطل دکھا''۔ ایسا نہ ہو کہ تلبیس ابلیس لعین سے حق کو باطل سمجھ بیٹھیں یا باطل کو حق سمجھ لیں! وَارۡزُقۡنَا اجۡتِنَابَهٗ ''اور ہمیں اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما''۔ یہ دونوں دعائیں بڑی اہم ہیں۔ عام حالات میں بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے' لیکن بالخصوص آج کا جو موضوع ہے' اس کے اعتبار سے اپنے حق میں بھی اور آپ سب کے حق میں بھی پورے خلوصِ قلب کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں یہ دونوں دعائیں کر رہا ہوں۔

*

چند اہم نکات کا اعادہ

اب آیئے اصل موضوع کی طرف' اور اس کے لیے چند بنیادی باتیں ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس سلسلۂ تقاریر میں ہمارا نقطۂ آغاز یہ تھا کہ نبوت کا اصل مقصد محاسبۂ اُخروی کے ضمن میں انسانوں پر اتمامِ حجت ہے' مبادا وہ یہ عذر پیش کر سکیں کہ اے ربّ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں اوّلین حجت تو انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ حقائق ہیں' مثلاً سماعت ہے' بصارت ہے' عقل وشعور کی صلاحیتیں ہیں' نیکی اور بدی کی تمیز ہے' قلب میں ودیعت شدہ معرفتِ ربانی ہے' روح کی گہرائیوں میں سلگتا ہوا عشقِ خداوندی کا جذبہ ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر ہر انسان مسئول اور جواب دہ ہے' لیکن رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ انسانوں کے لیے مزید آسانی پیدا کی جائے اور اس عظیم امتحان میں کچھ اور سہولتیں دی جائیں۔ چنانچہ وحی کا سلسلہ جاری فرمایا گیا' ہدایتِ ربانی نازل ہوتی رہی تاکہ عقل وخرد' شعور اور فطرت کے اندر جو صلاحیتیں مضمر ہیں' اُن کو اجاگر کیا جائے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے حق اور عدل وراستی کی طرف دعوت بھی دی اور اس پر عملاً چل کر بھی دکھایا۔ قافلۂ نبوت قافلۂ انسانیت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا۔ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے قافلۂ انسانی نے بھی ارتقائی مراحل طے کیے اور نبوت ورسالت بھی ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتی رہی' تا آنکہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نبوت ورسالت اتمام اور تکمیل کو پہنچ گئی اور نتیجتاً ختم ہوگئی۔ ختمِ نبوت نتیجہ ہے اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا۔

اس اتمام وتکمیلِ رسالت کے تین پہلو اہم ہیں۔ ایک یہ کہ نوعِ انسانی بحیثیتِ مجموعی عقل وشعور کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی' لہٰذا اس قابل ہوگئی کہ الہدیٰ (کامل ہدایت نامہ' ابدی ہدایت نامہ) اب اس کو عطا کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ قرآن مجید کی صورت میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔

دوسری طرف انسان کا اجتماعی شعور بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا کہ اُس دور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں اجتماعیت انفرادیت پر غالب آ جانے والی تھی' ہیئتِ اجتماعیہ اور نظامِ اجتماعی کی اہمیت فیصلہ کن ہو جانے والی تھی' افراد اس کے شکنجے میں جکڑے جانے والے تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اب صرف انفرادی ہدایت و رہنمائی نہیں' اجتماعی ہدایت و رہنمائی عطا کی جائے' ایک ایسا نظامِ عدل وقسط عطا کیا جائے جس میں انسان کے جملہ عواطف و میلانات اور اس کی فطرت وطبیعت کے تمام جبلی رجحانات کی تشفی کا پورا اہتمام ہو اور اُن میں بتمام وکمال توازن واعتدال ملحوظ رکھا گیا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک چیز پر زور دیا تو دوسری چیز ہاتھ سے جاتی رہی۔ آزادی پر زور دیا تو اونچ نیچ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ انسانیت طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ مساوات پر زور دیا تو آزادی کی چڑیا ہاتھ سے اڑ گئی۔ اس کے برعکس تمام چیزیں بیک وقت ایک اجتماعی نظام میں سموئی ہوئی پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ دینِ حق ''اسلام'' کی صورت میں انسان کو دے دی گئیں' اور اس نظام کو چلا کر دکھا دیا گیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے یہ حجت بھی بتمام وکمال پوری ہو جائے۔

اسی ختم نبوت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ سابقہ تمام انبیاء و رُسل صرف اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے اور انبیاء و رُسل کی اس مقدس جماعت میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ﷺ فداہ آباء نا و اُمّھاتنا پہلے اور آخری فرد ہیں جن کی بعثت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہوئی' پورے کرۂ ارضی کے لیے مکان کے اعتبار سے اور تا قیامِ قیامت زمان کے اعتبار سے' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء) اور: ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸) آپ ﷺ مبشر اور نذیر بن کر آئے۔ یہی بشارت اور انذار محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔

ان تین امتیازات کے ساتھ آنحضور ﷺ کو ایک تو ہدایتِ کاملہ عطا کر دی گئی اور اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا گیا۔ دوسرے صرف انفرادی رہنمائی نہیں' نظامِ اجتماعی کے

*

3

اعتبار سے ایک متوازن اور معتدل نظامِ عدل وقسط یعنی ''الدّینُ القیّم'' عطا کر دیا گیا اور نبی اکرم ﷺ نے ۲۳ سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں دونوں کام کر دیے۔ الہدیٰ کی تبلیغ مکمل کی اور اس پر حجۃ الوداع میں گواہی لے لی۔ دوسری طرف اس نظام عدلِ اجتماعی کو' دین حق کو بالفعل قائم کر دیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہوگئی' اللہ کا دین غالب ہوگیا' کفر اور شرک کا استیصال ہوگیا۔ زیادہ سے زیادہ اہل کتاب کو یہ چھوٹ دی گئی کہ وہ چاہیں تو اپنے دین یہودیت اور نصرانیت پر قائم رہیں' البتہ اپنے ہاتھوں جزیہ دینا ہوگا اور چھوٹے بن کر رہنا ہوگا۔ اس لیے کہ بڑا تو اللہ ہے' بڑائی اللہ کے لیے ہے اور غلبہ اللہ کے دین کے لیے ہے۔ یہ اسی تکبیر ربّ کا ظہور اور اس کا تقاضا ہے۔

یہ دونوں کام وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک بنفسِ نفیس خود سرانجام دے دیے۔ آپؐ کے کام کا تیسرا پہلو تھا مذکورہ بالا امور کی عالمی سطح پر تکمیل۔ اب یہ فرضِ منصبی قرار پایا اُمت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کے بارے میں ہدایت دے دی کہ ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) ''اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں' اُن کو جو یہاں موجود نہیں''۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان بلیغ الفاظ میں وہ اقوام بھی شامل ہیں جو اُس وقت جزیرہ نمائے عرب کے باہر تھیں۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا کہ: ؎

بس رہے تھے یہیں سلجوقی بھی' تورانی بھی اہل چیں چین میں' ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

تو نمعلوم کتنی اقوام تھیں' وہ بھی شامل ہوگئیں اور تا قیامِ قیامت آنے والے تمام افرادِ انسانی بھی اس لفظ ''غائب'' میں شامل ہوگئے۔

دوسرا پہلو ہے دین حق کو عالمی سطح پر پھیلانے کا۔ تو اس کا رسول اللہ ﷺ نے بنفس نفیس آغاز فرما دیا۔ سربراہانِ ممالک کے نام دعوتی خطوط لکھے جن کے نتیجے میں سلطنتِ روم سے تصادم کا آغاز ہوگیا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ روم اور ایران کے مابین تصادم میں مسلمانوں کی ہمدردیاں سلطنت روما کے ساتھ تھیں' لیکن یہ تاریخ کے عجیب حقائق ہیں

کہ اسی سلطنت روما سے تصادم کا آغاز ہوا‘ سلطنتِ ایران کے ساتھ تصادم بعد میں ہوا۔

کیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا؟

ایک مسئلہ ہمارے ہاں بڑا ہی پیچیدہ بنا ہوا ہے کہ آیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا؟ ایک جانب سے الزام عائد کیا گیا اور دوسری جانب سے مدافعانہ اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا اور حقیقت اسی خرافات میں کھو کر رہ گئی۔ مغرب اور عالمِ عیسائیت کی طرف سے اہل اسلام پر الزام عائد کیا گیا کہ ع ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' یہ مسلمان بڑے وحشی لوگ تھے‘ انہوں نے اپنا دین بالجبر تلوار کے زور سے پھیلایا ہے۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں‘ ہم دلوں کو جیتتے ہیں‘ ہمارے مشن کبھی بھی عیسائیت کی تبلیغ کے لیے جبر اور طاقت کا استعمال نہیں کرتے‘ جب کہ اسلام اس کے برعکس انداز میں قوت سے پھیلا ہے‘ طاقت سے پھیلا ہے‘ تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بھیانک تصویر دنیا کے سامنے آتی ہے۔ نتیجتاً ہمارے ہاں دین وملت کے ساتھ خیر خواہی رکھنے والے بعض نیک اور بھلے لوگوں نے مدافعت کی اور انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں وضاحت پیش کی کہ نہیں نہیں‘ یہ بات نہیں ہے‘ اسلام میں جنگ تو صرف مدافعت کے لیے جائز ہے‘ جارحانہ جنگ اسلام میں ہے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں یہ انداز سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے رفقاء نے اختیار کیا۔ ان کا خلوص واخلاص شک وشبہ سے بالاتر ہے‘ لیکن ہر دور کا کچھ اثر ہوتا ہے جس سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس معاملے میں اصل نقطۂ عدل ہے کیا؟ گزشتہ تقریروں میں دو مواقع پر یہ مسئلہ ضمنی طور پر زیر بحث آ چکا ہے۔ ہجرت کے فوراً بعد جب سلسلۂ غزوات کا آغاز ہوا تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہ سمجھئے کہ اگر اہل مکہ کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ بھی مدینہ منورہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دین حق کا غلبہ کیسے ہوتا؟ کفر اور شرک کا استیصال کیسے ہوتا؟ اللہ کا وہ گھر جو بُت کدہ بنا ہوا تھا اُسے نجاست سے پاک کیسے کیا جاتا؟ پرامن بقائے باہمی

*

(peaceful coexistence) اور غیر متبدل حالت (status quo) وغیرہ بڑے خوبصورت سے نام ہیں‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کا وجود کہیں نہیں ہے۔ حق اور باطل دو ایسی تلواریں ہیں جو ایک نیام میں نہیں سما سکتیں‘ حق اور باطل ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ حق آئے گا تو باطل پیچھے ہٹے گا‘ باطل بڑھے گا تو حق دبے گا۔ ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے‘ یہ ایک دوسرے کو گوارا نہیں کر سکتے۔ قرآن حکیم میں دوٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے: ﴿جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسراء یل) ’’حق آیا اور باطل نکل بھاگا‘ بے شک باطل ہے ہی نکل بھاگنے والا‘‘۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد از خود اقدام فرمایا اور اہل مکہ کی معاشی ناکہ بندی (economic blockade) کر کے گویا ان کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی طرح اگر نبی اکرم ﷺ ایک سفیر کے قتل کو برداشت کر لیتے تو جنگ موتہ نہ ہوتی‘ اور یہ جنگ نہ ہوتی تو سفر تبوک نہ ہوتا۔ جنگ موتہ کے نتیجہ میں اگر مسلمانوں کو کچھ نقصان اٹھانا پڑا تو غزوۂ تبوک میں نبی اکرم ﷺ کو اس سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس سے مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ آپؐ تیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ بیس دن تک تبوک میں مقیم رہے اور قیصر مقابلے میں نہیں آ سکا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ علاقے کے تمام سردار‘ رؤسا اور قبائلی شیوخ حاضر خدمت ہوتے رہے‘ کسی نے اسلام قبول کر لیا‘ کسی نے معاہدہ کر لیا۔

اس کے بعد آپؐ نے جیش اُسامہ کس لیے تیار کیا؟ کوئی تازہ اشتعال انگیزی (provocation) تاریخ کے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے‘ لیکن جیشِ اُسامہ تیار ہے‘ جبکہ نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ مَیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بڑے پرزور طریقے سے مشورہ دیا گیا کہ ان تین محاذوں میں سے کم از کم ایک محاذ کو ابھی آپ بند کر دیں‘ بیک وقت تین محاذوں کا کھولنا حکمت کے خلاف ہوگا‘ لیکن وہ تو خلیفۂ کامل تھے۔ جیسے محمدؐ رسول اللہ ﷺ رسولِ کامل ہیں‘ اسی طرح حضرت ابوبکر

صدیق ؓ خلیفۂ کامل تھے۔ خلافت کا جامہ بتمام و کمال حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی شخصیت پر راست آتا ہے۔ انہوں نے اس مشورہ کے جواب میں فرمایا کہ جس کام کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا میں اس سے قدم کیسے پیچھے ہٹالوں؟ جو کم سے کم شرائط محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے معین کر دیں' ان سے کم پر میری صلح کیسے ہوسکتی ہے؟ اگر ایسا کروں گا تو یہ دین میں ترمیم ہو جائے گی۔ انقلابی نظریات کے ضمن میں ایک اصطلاح ترمیم پسندی(revisionism) کی استعمال ہوتی ہے۔ جب کوئی انقلابی نظریہ آتا ہے' وہ قائم ہوتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے پیروسوچتے ہیں کہ اس پر چلنا مشکل ہے' لہٰذا کچھ ترمیم کر دی جائے۔ روس اور چین کے درمیان یہی بات بنائے نزاع رہی ہے اور چینی اشتراکیوں کا روسیوں پر یہ سب سے بڑا الزام تھا کہ یہ ترمیم پسند (revisionists) ہیں۔ مارکس کا جو اصل فلسفہ تھا اور لینن کا جو اصل انقلاب تھا روس اس پر قائم نہیں رہا اور انہوں نے اس سے عملی انحراف کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اگر رسول اللہ ﷺ کی کم سے کم شرائط میں سے کسی کو کم کر دیتے تو یہ وہ ''ترمیم پسندی'' ہوتی جس سے نبی اکرم ﷺ کے موقف میں ترمیم ہو جاتی' جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے کسی طرح ممکن نہ تھی۔ چنانچہ جیشِ اُسامہ روانہ کیا گیا اور وہی سلطنت روما کے ساتھ باقاعدہ جنگوں کی تمہید بن گیا اور فتوحاتِ شام شروع ہوگئیں۔

نظامِ باطل کے خاتمہ میں طاقت کا استعمال

ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھیے' کیونکہ یہ اپنی جگہ اٹل تاریخی حقائق ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ کی روشنی میں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس معاملے میں نقطۂ عدل کچھ اس طرح بَین بَین واقع ہوا ہے کہ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں تلوار کو سرے سے کوئی دخل نہیں اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی تبلیغ ہی تلوار کے بل پر ہوئی۔ اسلام دو چیزوں میں بڑا بنیادی فرق کرتا ہے' ایک ہیں افراد اور ایک ہے نظامِ اجتماعی۔ افراد میں سے کسی فرد کو اپنا دین تبدیل کرنے پر اسلام مجبور نہیں کرتا۔ پوری تاریخ میں کسی ایک بھی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں ملتا' لیکن غلط بنیادوں پر مبنی نظامِ اجتماعی کو

*

5

اسلام گوارا نہیں کرسکتا۔ اس کو ملیا میٹ کرنا اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا مسلمانوں کے لیے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو بات اور ہے' لیکن اگر طاقت موجود ہو اور کسی باطل نظام کا وجود گوارا کر لیا جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ غلط نظام کو قوت کے بل پر توڑا جائے گا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجیے اور یہ فلسفۂ دین کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ درحقیقت غلط نظام بندوں اور ربّ کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جہاں اور بڑی خدمات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک بہت بڑے عمرانی مفکر کی حیثیت سے' دو اعتبارات سے اس نظامِ اجتماعی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر نظام ظالمانہ یا استحصالی ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس عیش و عشرت کے لیے ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے اور کچھ لوگ دو وقت کی نانِ جویں کے لیے محتاج ہو جاتے ہیں۔ جن کے پاس دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہ اس کی وجہ سے خدا سے دور ہو جاتے ہیں اور جن کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول مشکل ہو گیا ہے وہ بالکل ڈھور ڈنگروں کی سطح پر آ جاتے ہیں' وہ خدا کو کیا پہچانیں اور اس کی کیا بندگی کریں؟ وہ تو دو وقت کی روٹی کے لیے جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں' جیسے باربرداری کا اونٹ یا کولہو کا بیل ہو۔ اگر انسان کو اس سطح پر گرا دیا جائے تو اس کا کہاں امکان ہے کہ وہ غور و فکر کرے کہ یہ آسمان کس نے بنایا' یہ زمین کس نے بنائی اور فطرت کے اشارات کو پڑھے: ع

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!

کہاں معرفتِ ربانی اور عبادتِ ربانی! انسان ان چیزوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور یہ ظالمانہ نظام بندے اور ربّ کے درمیان سب سے بڑا حجاب بن جاتا ہے۔ یہ ہے اہمیت نظامِ اجتماعی کی۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: ۲۵)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ

کتاب اور میزان تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔''

سورۃ الشوریٰ میں آنحضورﷺ سے فرمایا گیا:

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ (آیت ۱۵)

''اور آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ میں ایمان لایا ہر کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں''۔

یہی بات ہے جو خلیفۂ کامل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمائی۔ بیعتِ خلافت کے بعد آپؓ نے جو پہلا خطبہ دیا اس میں خلافت کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

''مسلمانو! تم میں ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ اُس سے حق وصول نہ کرلوں' اور ہر ضعیف قوی ہے جب تک کہ مَیں اس کا حق نہ دلوادوں''۔

یہ ہے اس بات کی اہمیت کہ نظامِ باطل کو کسی درجے میں بھی گوارا نہ کیا جائے۔ یہ ظالمانہ نظام ہے جو کسی ایک خاندان کو نوعِ انسانی کی گردن پر مسلط کر رہا ہے کہ وہ حاکم ہے یہ محکوم ہے۔ بقول اقبال: ع

''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!''

کہیں اس نے سرمایہ کو ایک لعنت بنا کر مسلط کر دیا ہے اور انسانوں کو دو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے' ایک محروم طبقہ اور دوسرا وہ طبقہ جنہیں فراوانی کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ جن کی ایک ایک تقریب پر لاکھوں روپے صرف ہو جاتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک زمانے میں جبکہ لاہور میں میرے درس کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا' ایک صاحب سمن آباد میں میرے درس میں شریک ہوا کرتے تھے' ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد اُن کے لڑکے کی شادی کا مرحلہ آیا تو اس نے آ کر مجھ سے کہا کہ اگر ابا جان زندہ ہوتے تو یقیناً آپ سے درخواست کرتے کہ آپ نکاح پڑھائیں' لہٰذا میری درخواست ہے کہ میرا نکاح آپ پڑھائیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ یہ ۶۸-۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ میں وہاں گیا اور مَیں نے شادی کا جو نقشہ وہاں دیکھا' معلوم ہوتا تھا کہ ہر درخت کے ہر پتے کے ساتھ ایک قمقمہ لگا ہوا ہے۔ روشنیوں کا ایک طوفان' لاتعداد مہمان'

*

بہترین یونیفارم میں ملبوس بیرے اور اسراف وتبذیر کے تمام تر سامان موجود تھے۔ اس موقع پر میں نے وہاں جو تقریر کی وہ میری زندگی کی سخت ترین تقاریر میں سے تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خطبۂ نکاح جنتر منتر کے انداز میں تو پڑھتا نہیں ہوں۔ خطبہ تو خطبہ ہوتا ہے، جس کی غرض تذکیر ہے۔ مَیں نے کہا کہ یہ ہماری منافقت ہے کہ ہم نام لیتے ہیں فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا اور عمل ہمارا یہ ہے! یعنی قول وفعل میں بالکل مطابقت نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب نصیحت فرمائی ہے:۔

اگر پندے ز درویشے پذیری ہزار اُمت بمیرد تو نہ میری!
بتولےؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرےؓ بگیری!

''اگر تو کسی درویش سے کوئی نصیحت حاصل کرنا چاہتی ہے تو میری یہ نصیحت اپنی گرہ میں باندھ لے۔ خواہ ہزاروں قومیں نیست و نابود ہو جائیں اے مسلمان عورت، کہیں تو نہ مرجانا! تو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا اُسوہ اختیار کر اور اس زمانے کی آنکھ سے اوجھل رہ، تاکہ تیری آغوش میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے نونہال پروان چڑھیں''۔

اُس زمانے میں سرخ ٹوپیوں والوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور سرمایہ دار بڑا گھبرا رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے! مَیں نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ کہاں سے آ گئے ہیں؟ یہ کہیں روس سے تو نہیں آئے، یہ آپ کی ان غلط حرکتوں کا نتیجہ ہے جو سامنے آ رہا ہے۔ میں نے کہا ذرا سوچیے، یہی بیرے جو آپ کو serve کر رہے ہیں، اور ایسے ہی آپ کے شوفر، آپ کے چوکیدار، آپ کے خانسامے وغیرہ، ان میں سے کتنے ایسے ہوں گے جن کے گھروں میں جوان بچیاں بیٹھی ہوں گی اور وہ اُن کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکتے، شادی بیاہ کے جو کم سے کم لوازمات ہیں وہ بھی ان کو میسر نہیں اور آپ کے ہاں یہ اللّے تللّے ہو رہے ہیں!

چنانچہ یہ حقیقت خوب سمجھ لیجیے کہ اسلام نظامِ باطل کو کسی صورت گوارا نہیں کرتا، بلکہ اس کا قلع قمع کرتا ہے۔ اسلام اس کے لیے طاقت استعمال کرتا ہے۔ اگر طاقت موجود نہ

ہوتو الگ بات ہے' لیکن اگر موجود ہوتو وہ تلوار استعمال کرتا ہے۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ تین متبادل (alternatives) دیے ہیں' جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دیے ہوئے ہیں: (۱) اسلام لے آؤ' اس صورت میں تم ہمارے بھائی ہوگے۔ جس طرح کسی دوسرے مسلمان کا جان و مال محترم ہے' ایسے ہی تمہارے جان و مال کا احترام ہوگا۔ (۲) اگر یہ نہیں کرتے تو چھوٹے بن کر رہو' جزیہ دو' تمہیں کوئی بالجبر مسلمان نہیں کرے گا۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّہُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ) یہودی اور عیسائی رہو' لیکن چھوٹے ہو کر رہنا پڑے گا۔ آئینِ ملکی (Law of the Land) اس کا ہوگا جس کی فی الواقع زمین ہے' کیونکہ ''اَلۡاَرۡضُ لِلّٰہِ' اَلۡمُلۡکُ لِلّٰہِ!' البتہ پرسنل لاء میں تمہیں آزادی ہے' جو چاہو کرو۔ اور (۳) اگر یہ دونوں چیزیں منظور نہیں ہیں تو میدان میں آؤ' تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ یہ تاریخ کی وہ حقیقت ہے جس کے لیے کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔ جس نے کبھی تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ یہی تین متبادل ہمیشہ پیش کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اس نقطۂ عدل کو پہچان لیجیے۔ کسی فرد کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا' نہ کیا جائے گا' ازروئے الفاظ قرآنی:

﴿لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

''دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے' بے شک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔''

لیکن نظامِ باطل جو یقیناً ظالمانہ نظام ہے' اسے مسلمان ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام اس کے وجود کو اپنے لیے چیلنج سمجھتا ہے اور اس کا قلع قمع جبر اور قوت کے ساتھ اسلام کا نصب العین ہے۔

اس اعتبار سے اگر مسلمانوں کے پاس طاقت ہو تو نظامِ باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے اس طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے دوران فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ لوگ ہم پر چڑھائی

*

کر کے کیوں آئے ہو؟ تو انہوں نے جواب میں جو جملہ فرمایا اسے خلافتِ راشدہ کے ماٹو (motto) کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھئے کہ اُس وقت روئے ارضی پر دو عظیم سلطنتیں تھیں جو اپنے وقت کی سپر پاورز تھیں۔ ایک سلطنت کسریٰ اور دوسری سلطنت روما۔ جزیرہ نمائے عرب کا علاقہ ان دونوں کے درمیان واقع تھا جو ایک لق و دق صحرا تھا۔ دونوں سلطنتوں میں سے ہر ایک عربوں کو اپنے زیر اثر رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ویسے درحقیقت یہ آزاد قبائلی علاقہ تھا' اور اس طرح کے دیگر علاقوں کے باشندوں کی طرح عربوں کا پیشہ بھی بالعموم لوٹ مار تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب اپنے گھر میں پیدا کچھ نہ ہوتا ہو تو کہاں سے کھائیں گے؟ چنانچہ عربوں میں یہی طریقہ رائج تھا کہ کہیں جا کر ہلہ بول دیا اور کچھ لوٹ مار کر کے لے آئے۔ چنانچہ ایرانیوں نے یہ کہا کہ تم پہلے تو اس طرح آیا کرتے تھے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جایا کرتے تھے' اب تم کسی طرح ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے' یہ فرق کیوں ہے؟ ہم تمہیں کچھ دے دلا دیتے ہیں' جو کہتے ہو دے دیتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے جو تاریخی جملہ کہا اس کا ایک ایک لفظ نوٹ کر لیجیے۔ ایسے ہی ایک موقع پر یہ بھی کہا گیا تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے' پہلے ہم لوٹ مار کرتے تھے جینے کے لیے' اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے' لیکن اب جو لوگ میرے ساتھ آئے ہیں ان کی تو قلبِ ماہیت ہو چکی ہے' وہ بالکل بدلے جا چکے ہیں' اب یہ وہ لوگ ہیں جنہیں زندگی کی نسبت موت عزیز تر ہے۔

اب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا وہ جملہ ملاحظہ کیجیے۔ فرمایا:

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ

''ہم بھیجے گئے ہیں تا کہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے آئیں اور بادشاہوں کے جور و ستم سے نجات دلا کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں''۔

یعنی ہم بھیجے گئے ہیں' خود نہیں آئے۔ پہلے ہم لوٹ مار کرنے آتے تھے' لیکن اب ہم ایک

مشن پر ہیں۔ یہ رسالتِ محمدیؐ کا مشن ہے‘ جس کی تکمیل پر ہم مأمور ہیں۔ ہمیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے آئیں اور بادشاہوں کے ظلم وتشدد کی چکی سے‘ جس میں وہ پس رہے ہیں‘ نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ یہ خلافت راشدہ کا مشن ہے‘ یہ ماٹو (motto) ہے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ خلافت راشدہ کو صرف مسلمانوں کی ایک حکومت یا صرف ایک سیاسی نظام نہ سمجھئے۔ اگرچہ ایک سیاسی نظام یا ہیئت اجتماعیہ کے اعتبار سے بھی اس کی برکات بڑی ممتاز ہیں‘ لیکن اسے اگر صرف اس حد تک سمجھیں گے اور اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں گے تو اس کی پوری تصویر سامنے نہیں آ سکے گی۔ وہ تو درحقیقت جانشینیٔ رسول ﷺ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے۔

اس خلافت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر گفتگو گزشتہ نشست میں ہو چکی ہے کہ یہ دورِ خلافت مختصر تھا‘ لیکن کارنامہ انتہائی عظیم تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف جتنی قوتیں ابھریں‘ جن کو آپ مزاحمتی قوتیں یا انقلاب مخالف قوتیں کہہ سکتے ہیں‘ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان تمام قوتوں سے پوری قوت کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نبرد آزما ہوئے اور اس انقلاب کو جزیرہ نمائے عرب کی حد تک کامل طور پر مستحکم (consolidate) کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کا چوبیس سالہ دور ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نوعِ انسانی پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی اصل حجت اُسی دور میں قائم ہوئی ہے‘ اس لیے کہ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی برکات کا ظہور خلافتِ راشدہ ہی میں ہوا ہے۔

دورِ فاروقیؓ وعثمانیؓ میں اسلام کی برکات کا ظہور

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک مسلسل جدوجہد اور ایک پیہم کشمکش ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس جدوجہد کے دوران حالات و واقعات کی رفتار اتنی سریع اور اس کا tempo اتنا تیز تھا کہ واقعتاً ایک دفعہ تو انسان چکرا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تاریخ انسانی

*

میں یہ ایک ہی بار ہوا ہے کہ ایک انسانی عرصۂ حیات (lifespan) میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور ایک وسیع و عریض خطے پر ایک نظام بالفعل قائم ہو گیا۔ کل بائیس برس میں دعوت، تنظیم اور تربیت کے مراحل بھی طے پا گئے، کشمکش بھی ہو گئی، ٹکراؤ اور مسلح تصادم بھی ہو گیا، فتح بھی ہو گئی، قیامِ امن بھی ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ صرف بائیس برس میں ہو گیا! تو اب آپ خود سوچیے کہ حالات و واقعات کی تیز رفتاری کا کیا عالم ہو گا! اس کے بعد جو نظام پھر خلافت راشدہ میں قائم ہوا ہے، اس کا پورا کریڈٹ بھی آنحضور ﷺ کو جاتا ہے۔ آخر عمر رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ عمر بن الخطاب کو عمرِ فاروق کس نے بنایا؟ یہ کس کی مسیحائی ہے؟ ظاہر ہے یہ نبی اکرم ﷺ ہی کی تربیت کا کرشمہ تھا۔ چنانچہ اس کا سارا کریڈٹ آپ ﷺ ہی کو جاتا ہے۔ جیسے ایک بند کلی ہو اور پھر وہ کھل کر پھول بن جائے، پھول میں پتیاں وہی ہیں جو کلی میں تھیں، کسی نئی پتی کا اضافہ نہیں ہوا، لیکن بہرحال وہ پھول کھلتا ہے تب پتیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ کلی میں وہی پتیاں ہیں لیکن بند ہیں۔ تو بالقوۃ (potentially) وہ ساری برکات نبی اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام میں اوّل یوم سے موجود تھیں، لیکن ان کا جو ظہور ہوا ہے وہ دورِ خلافت حضرت عمر فاروق اور دورِ خلافت حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) میں ہوا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں بڑے بڑے مغالطے لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں اس پر تفصیلی گفتگو تو بعد میں کروں گا، اِس وقت یہ ذہن میں رکھیے کہ خلافت راشدہ میں طویل ترین دورِ خلافت حضرت عثمانؓ کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اڑھائی سال، حضرت عمرؓ کے دس سال اور حضرت عثمانؓ کے بارہ سال ہیں۔ ان بارہ سال میں سے دس سال تو بالکل اسی شان کے ہیں جس شان کا دورِ فاروقی تھا۔ اختلاف، نزاع، فتنہ، یہ سب کچھ آخری دو سال میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اذہان میں یہ نقشہ بٹھا دیا گیا ہے کہ شاید خیر و خوبی اور بھلائی صرف دورِ فاروقی میں تھی، دورِ عثمانی میں تو فتنہ و فساد اور اختلاف تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخی غلطی ہے، جس کا ازالہ

کر دینا ضروری ہے۔ دس سالہ دورِ فاروقیؓ اور حضرت عثمانؓ کے پہلے دس سال ملا کر بیس سال بنتے ہیں۔ بیس سال کے اس عرصہ میں دو کام ہوئے۔ ایک تو غلبۂ دین، جس کا حکم نبی اکرم ﷺ کو لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے الفاظ میں دیا گیا تھا۔ اس کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ: ؎

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
تھمتا نہ تھا کسی سے سَیلِ رواں ہمارا!

شام فتح ہوا، ایران فتح ہوا، ترکستان کے علاقوں تک بات پہنچی ہوئی ہے، شمالی افریقہ تقریباً پورا فتح ہو چکا ہے، ایشیائے کوچک فتح ہو چکا ہے، صرف تھوڑا حصہ ''مدینۃ القصیر'' یعنی قسطنطنیہ بچا ہوا ہے۔ سلطنت روما کی تین ٹانگیں تھیں، جن میں سے دو ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ تین براعظموں پر پھیلی ہوئی بہت بڑی سلطنت تھی، یعنی پورا شمالی افریقہ، پورا مغربی ایشیا، ایشیائے کوچک (Asia Minor) اور پھر نیچے شام اور اردن۔ اس کے کچھ مقبوضات یورپ میں بھی تھے، لیکن اب وہ سمٹ کر یورپ تک محدود ہو گئی، ذرا سی انگلی قسطنطنیہ پر ٹکی رہ گئی۔ رہی سلطنتِ کسریٰ تو اس کے تو وہ پرزے ہوئے کہ باید و شاید۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ کسریٰ نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرزے کر دیے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ فتوحات کے اس سیلاب میں کشور کشائی یا مالِ غنیمت کو مقصود کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

شہادت کے دو مطلب ہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا کہ مسلمان کا اس سے بڑا مقصد اور کوئی نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک ہی تمنا ایسی ہے جو اللہ نے پوری نہیں کی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کی بھی کوئی تمنا اللہ تعالیٰ پوری نہ کرے! رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک شدید خواہش اور تمنا کا اظہار اِن الفاظ میں کیا تھا:

*

9

((لَوَدِدْتُ أَنِّیْ أُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ أُحْیَا ، ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْیَا ، ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْیَا ، ثُمَّ أُقْتَلُ)) (۱)

''میری بڑی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں''۔

لیکن آپؐ کی تمنا پوری نہیں کی گئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک اٹل قانون ہے کہ رسول کبھی قتل نہیں ہوتے۔ رسول نمائندہ ہے اللہ کا اور اللہ کی حکومت کا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ (المُجادلة: ۲۱) ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول غالب رہیں گے!'' رسول کہیں مغلوب ہونے کو آئے تو پوری کی پوری قوم کو تہس نہس کر دیا گیا، لیکن رسول مغلوب نہیں ہوا۔ اس لیے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی یہ خواہش پوری نہیں کی گئی۔

شہادت کا ایک معنیٰ تو مقتول فی سبیل اللہ ہونا ہے اور دوسرا اللہ کے دین کی اور توحید کی گواہی دینا ہے، جیسے اقبال نے کہا: ع

''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!''

یہ وہ گواہی ہے جس کو ادا کر کے آپ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یہ گواہی انفرادی طور پر بھی دی جاتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

غیروں کی گواہی

بہرحال خلافت فاروقی و عثمانی میں ایک کام تو یہ ہوا کہ روئے ارضی کے ایک وسیع و عریض رقبے پر سے انسانوں کو بادشاہوں کے ظلم و جور سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرایا گیا اور غلامی کے جوئے ان کی گردن سے اتار دیے گئے۔ اس امر کی گواہی

(۱) صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب ما جاء فی التمنی ومن تمنّی الشهادة، وکتاب الجهاد، باب تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

دوسروں نے بھی دی ہے۔ کسریٰ کا ایک ایلچی حضرت عمرؓ سے ملنے آیا۔ اس نے اہل مدینہ سے پوچھا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ جواب ملا: لَیْسَ لَنَا مَلِکٌ وَلَنَا اَمِیْرٌ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں ہے' ہمارا تو ایک امیر ہے۔ اس نے پوچھا: اچھا تو اس امیر کا قصرِ امارت کہاں ہے؟ جواب ملا: اس کا کوئی قصر امارت نہیں' وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر مدینہ سے باہر گیا ہے۔ کسریٰ کا ایلچی اٹھا اور باہر جا کر دیکھا کہ عمر فاروقؓ ایک جھاڑی کے سائے میں اپنے کوڑے کو تکیہ بنائے ہوئے استراحت فرما رہے ہیں۔ جس عمر فاروقؓ کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے وہ یوں فرشِ زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ ایلچی کچھ دیر دم بخود اس منظر کو دیکھتا رہا اور آخر پکار اٹھا کہ اے عمر! تم عدل و انصاف سے کام لیتے ہو' لہٰذا تمہیں کوئی ڈر نہیں' جبکہ ہمارے بادشاہ ظلم کرتے ہیں' لوگوں کا خون چوستے ہیں' لہٰذا ہر وقت کانپتے رہتے ہیں اور اسی لیے انہیں باڈی گارڈ بھی چاہئیں' اونچی اونچی فصیلوں والے محلات بھی چاہئیں' تحفظات بھی چاہئیں۔ یہ تھی وہ رائے جو سفیرِ کسریٰ نے اسلام کے نظامِ عدل اور اپنے ہاں کے نظامِ جور کے متعلق ظاہر کی۔

تو اتنے بڑے رقبے پر اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ غلبہ اس معنی میں کہ نوعِ انسانی کی غلامی کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں' غلامی کے طوق ان کی گردنوں سے اتار دیے گئے۔ ع

''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!''

کوئی حاکم نہیں' کوئی محکوم نہیں' کوئی مالک نہیں' کوئی مملوک نہیں! لوگوں سے صرف ایک مطالبہ ہے: کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا ''اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ!'' اس بات کو نوٹ کر لیجیے کہ انسانی اخوت و مساوات کا سب سے بڑا چارٹر اسلامی چارٹر ہے۔ اس کے آگے تنظیم اقوام متحدہ کے چارٹر کی کیا حیثیت ہے؟ حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) وہ خطبہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

((یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ

لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) (مسند احمد)

''لوگو! آ گاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا ربّ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

اس بات کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بدترین دشمنوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے محض وعظ نہیں کہے بلکہ ان اصولوں پر فی الواقع ایک معاشرہ قائم کر کے دکھایا۔ کہا جاتا ہے کہ: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ ''اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں!'' چنانچہ ایچ جی ویلز (H.G.Wells) نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بہت معروف شخصیت ہے اور سائنٹیفک فکشن میں اس کا بڑا اونچا مقام ہے۔ اس نے سائنسی خیالات پر مبنی کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو بھی افسانوی انداز سے پیش کیا ہے۔ ایسے خوبصورت پیرائے میں تاریخ لکھی ہے کہ آدمی پڑھے تو ذہن بوجھل محسوس نہ ہو۔ اس کی دو کتابیں ''A Short History of the World'' اور ''A Concise History of the World'' بہت مشہور ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی جان لیجیے کہ اس بدبخت نے رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی پر بڑے رکیک حملے کیے ہیں' کیونکہ تعدّدِ ازواج کی کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے کسی طرح نیچے نہیں اترتی۔ اوّل تو اُن کے ہاں شادی کرنا ہی گھٹیا کام ہے' ان کی اپنی اقدار ہیں' تجرد کی زندگی بسر کرنا ان کے ہاں اونچے درجے کا کام ہے۔ شادی کرنا اور پھر متعدد شادیاں' یہ انہیں کسی طرح قبول نہیں۔ یہ شخص پیغمبر اسلام ﷺ سے اپنے تمام تر بغض وعناد کے باوجود اپنی کتاب میں پورا خطبۂ حجۃ الوداع نقل کرتا ہے اور پھر گھٹنے ٹیک کر یہ اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے:

''اگر چہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

اس سے بڑا خراجِ تحسین اور ہو نہیں سکتا' اور پھر ایسے ذلیل شخص کی زبان سے جس کی نگاہوں سے آنحضورﷺ کی ذاتی عظمت چھپی رہ گئی۔ لیکن وہ آپﷺ کے کارناموں کو کیسے جھٹلا سکتا ہے! اگر چہ اس کا تعصب اس کی آنکھوں کی پٹی بن گیا اور آنحضورﷺ کی شخصی عظمت کا وہ اندازہ نہ کر سکا' لیکن تاریخ کی ایک عظیم حقیقت کو جھٹلائے تو کیسے جھٹلائے؟ بہر حال اتنے وسیع و عریض رقبے پر اس نظام کو قائم کر دینا' جس میں ہر اعتبار سے عدل و قسط اور انصاف مکمل ہو' درحقیقت اسلام کا نوعِ انسانی پر ایک عظیم احسان تھا۔

نظامِ اجتماعی کے باہم متصادم پہلو

اب ایک بات سمجھ لیجیے کہ نظامِ اجتماعی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ متصادم (conflicting) ہوتے ہیں۔ انفرادی آزادی اور اجتماعی مصلحتیں باہم ٹکراتی ہیں۔ انسان کہتا ہے مجھے آزادی ہونی چاہیے' میں جو چاہوں کروں' جو چاہوں سوچوں' جو چاہوں زبان سے کہہ دوں۔ لیکن یہ شخصی آزادی اجتماعی اعتبار سے مضر ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں نقطۂ عدل یہ ہے کہ آزادی بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعی مصلحتیں بھی پامال نہ ہوں۔ یہ بڑا کٹھن کام ہے' بہت مشکل معاملہ ہے۔ اسی طرح سب مانتے ہیں کہ مساوات ہونی چاہیے۔ سو فیصد مساوات تو ظاہر ہے نہ کبھی دنیا میں ہوئی ہے' نہ ہو گی اور نہ ہی فطرت کے مطابق ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے سرخ و سپید رنگت دی ہے' کسی کا رنگ سیاہ کر دیا ہے۔ کسی کو یورپ میں پیدا کیا تو کسی کو افریقہ میں پیدا کر دیا' کسی کو ذہنی صلاحیتیں بہت دے دیں مگر جسمانی قوت نہیں دی۔ اس کے برعکس کوئی اگر چھ سات گھنٹے تک مسلسل کشتی چلا سکتا ہے تو اسے غور و فکر کی طاقت نہیں دی۔ تو یہ فرق و تفاوت تو

*

ضرور رہے گا۔ لیکن بہرحال مساوات بھی مطلوب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کو تو کھا کھا کر ہیضہ ہو رہا ہے اور ایک نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔ لیکن اس کی خاطر انسان کو اس طرح پابند کر دینا کہ آزادی بالکل ہی سلب ہو جائے' یہ بھی فطرت کے خلاف ہے۔ کیا کریں' بڑا مشکل معاملہ ہے! نوعِ انسانی انہی مسائل میں ٹھوکریں کھا رہی ہے' ایک بند کھولتے ہیں تو دوسرے کئی بندھنوں میں جکڑے جاتے ہیں۔ کبھی جاگیردارانہ نظام (Feudal System) پوری دنیا میں رائج تھا۔ سب سے اوپر بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے نیچے barons ہیں' lords ہیں' پنج ہزاری' بیس ہزاری' تیس ہزاری منصب دار ہیں۔ ان کے علاقے ہیں اور وہ ان علاقوں کے مالک ہیں۔ رہنے والے سب ان کی رعیت ہیں۔ گویا غلامی در غلامی پر مبنی ایک نظام ہے۔

یورپ نے حقوق حاصل کرنے کے لیے بڑا زور مارا' بڑی قربانیاں دیں۔ بادشاہ اور جاگیردار Divine Rights of King کے دعوے کے ساتھ مسلط تھے۔ اُن سے حقوق لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بہرحال یہ آزادی حاصل ہوئی تو وہ ایسی غیر معتدل ہوگئی کہ روپیہ میرا ہے' میں اس سے جو چاہوں کروں' چاہے شراب خانہ کھولوں' چاہے قحبہ خانہ کھولوں' مجھے آزادی حاصل ہے' کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے۔ روپیہ میرا ہے' مجھے آزادی حاصل ہے کہ اسے سود پر چلاؤں' اس پر قدغن کیسی؟ اس طرح اس آزادی نے سرمایہ داری کی لعنت کی شکل اختیار کر لی۔ جاگیرداروں سے نجات پائی تو سرمایہ دار مسلط ہو گئے کہ صاحب مجھے آزادی حاصل ہے' کارخانہ میرا ہے' میں تو یہی چند روپے مزدوری دوں گا' کسی کو کام کرنا ہے تو کرے' نہ کرنا ہو تو نہ کرے۔ کہنے کو مزدور بھی آزاد ہے' مگر مزدور آزاد کہاں ہے؟ جب وسائل کا ارتکاز چند لوگوں کے پاس ہو گیا ہو تو وہ چند روپے روزانہ اجرت کے عوض کام کرنے پر مجبور ہے۔ کبھی آپ کے ہاں سوڈا واٹر کی بوتلیں چلتی تھیں' ہر گلی میں مشین لگی ہوئی تھی۔ کسی کے پاس تھوڑے سے پیسے ہوئے' اُس نے مشین لگا لی اور بوتلیں بھر بھر کر بیچنے لگا۔ مگر پھر بڑے بڑے کارخانے لگ گئے اور وہ مشین غائب ہوگئی۔ ہر شخص کے لیے اس سطح کا کارخانہ لگانا ممکن نہیں جس سطح کا ایک سرمایہ دار

لگائے گا۔ چنانچہ چھوٹی معیشت والوں کا دروازہ بند ہو گیا' اور زیادہ سے زیادہ لوگ مجبور ہو گئے کہ ان کارخانوں میں جا کر ملازمت کریں۔ بظاہر آزاد ہیں لیکن درحقیقت مجبور ہیں کہ معمولی اجرت پر کام کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ چیزیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تو ان کا ردّعمل ظاہر ہوتا ہے۔ ؎

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری!

ظلم ایک حد کو پہنچنے کے بعد ایک ردِّعمل کو جنم دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی رنگ میں کچھ عرصہ تک سرمایہ داری مسلط رہی۔ پھر سرمایہ داری سے نجات حاصل کرنے کے لیے اشتراکیت کی ایک نئی تحریک چلی' جس کے نتیجے میں سوشلزم یا کمیونزم مسلط ہو گیا اور ایک پارٹی سٹیٹ قائم ہو گئی۔ یہ پارٹی اب بڑی جاگیردار (Big Land Lord) ہے' بڑی زمیندار ہے' بڑی سرمایہ دار ہے۔ چنانچہ آپ کی آزادی سلب ہو گئی' آپ جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔

آزادی و مساوات کے بے مثال نمونے

اس پس منظر میں دیکھئے کہ جو نظام محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا اور جس کی برکات کا ظہور خلافتِ راشدہ میں ہوا' وہ کیا تھا۔ آزادی کا یہ عالم ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسجد نبویؐ میں خطبہ دے رہے ہیں۔ ایسے میں ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ''لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ'' یعنی نہ کوئی بات سنیں گے اور نہ ہی اطاعت کریں گے! یہ کلمۂ بغاوت ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں کیوں بھائی؟ وہ شخص جواب دیتا ہے کہ آپ نے جو کُرتہ پہن رکھا ہے وہ مالِ غنیمت کی چادروں سے بنا ہے۔ ہر مسلمان کو اس سے ایک ایک چادر ملی تھی' جس سے کُرتہ نہیں بنتا' آپ جیسے طویل القامت شخص کا اس سے کرتہ کیسے بن گیا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا تھا: ''اگر میں سیدھا چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے' اور اگر میں ٹیڑھا ہو

*

جاؤں تو مجھے سیدھا کرنا تم پر لازم ہے!'' تو یہ درویش بھی عمر فاروق ؓ کا احتساب کر کے انہیں سیدھا کر رہا ہے۔

آپ غور کیجیے' بہترین سے بہترین جمہوری ملک میں بھی صدر مملکت' سربراہِ ریاست کو کتنا تحفظ دیا جاتا ہے! اس کو عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا' اس کے ذاتی معاملات کو زیر بحث نہیں لایا جا سکتا' اور یہاں معاملہ صرف ایک معمولی کرتے کا ہے' اور اس پر بھی جواب طلبی ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر ؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ ؓ سے کہا کہ تم بتاؤ! انہوں نے کھڑے ہو کر وضاحت کی کہ مَیں نے اپنے حصے کا کپڑا بھی ابا جان کو دے دیا تھا' کیونکہ ایک ایک چادر سے نہ میرا کرتا بن رہا تھا نہ ان کا۔ اس طرح ان کا کرتہ بن گیا۔ اس پر وہ درویش کہتا ہے کہ: اَلْآنَ نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ! کہ ہاں' اب ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ حریت کا اس سے اونچا کوئی معاملہ انسان نے نہ کبھی پہلے دیکھا نہ اس کے بعد۔

مصر کے گورنر نے اپنے گھر کے باہر ڈیوڑھی بنالی تھی۔ آخر وہ گورنر ہے' اسے کوئی وقت آرام کے لیے بھی چاہیے' یہ تو نہیں کہ جو چاہے اور جب چاہے منہ اٹھائے اندر چلا جائے۔ لیکن جب یہ بات حضرت عمر فاروق ؓ کے علم میں آئی تو اس پر ان الفاظ میں شدید سرزنش فرمائی: مَتَی اسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا؟ ''لوگوں کو تو اُن کی ماؤں نے آزاد جنا تھا' تم نے انہیں اپنا غلام کب سے بنا لیا؟'' اس کے ساتھ ہی وہ ڈیوڑھی مسمار کروا دی۔ حضرت عمر فاروق ؓ آرڈی نینس جاری کرتے ہیں کہ عورتوں کا حق مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر ایک عورت اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ عمر! ہمارے جس حق کی کوئی حد نہ اللہ تعالیٰ نے قائم کی اور نہ اللہ کے رسول ؐ نے' تم کون ہوتے ہو اُس کی حد مقرر کرنے والے؟ اور عمرؓ بلا تأمل کہتے ہیں کہ آج ایک بڑھیا نے عمر کو دین سکھایا ہے' اور آرڈی نینس واپس لے لیتے ہیں۔ یہ ہے آزادی! اگر آزادی کسی چڑیا کا نام ہے تو اس سے بڑی آزادی کا تصور ناممکن ہے۔

اس آزادی کے ساتھ اب آپ تصور کیجیے مساوات کا۔ وہ مساوات نہیں کہ آپ

نے سو آدمیوں کو ایک رسّے سے باندھ دیا اور کہا کہ دوڑو! اور آپ خوش ہو گئے کہ اس طرح وہ دوڑ میں مساوی رہیں گے' نہ کوئی آگے ہو گا نہ پیچھے۔ نہیں' بلکہ وہ مساوات کہ دوڑنے کی بھی پوری آزادی ہے۔ چونکہ شخصی ملکیت ایک محرک (incentive) ہے' اس لیے اسلام میں اس کی پوری آزادی ہے' لیکن ظاہر ہے کہ اس دوڑ میں آگے پیچھے رہنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ اگر تو ایک رسّے سے سب کو باندھ دیا جائے تو نہ کوئی آگے رہے گا نہ پیچھے۔ مگر جب کھلا چھوڑیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی آگے آئے گا اور کوئی پیچھے۔ اسلام اس تفاوت کو تسلیم کرتا ہے' مگر اس کا نظامِ معاشیات ایسا عادلانہ ہے کہ اس میں ایک نسبت و تناسب طے ہے کہ آگے والوں سے کیا لیا جائے گا اور پیچھے رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ بہرحال پوری کی جائیں گی۔ گویا ایک لکیر کھینچ دی گئی ۔ چاہے تو جدید اصطلاح میں haves اور havenots کہہ لیجیے' چاہے فقیر اور غنی۔ فقیر کون ہے؟ جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا باون تولے چاندی موجود ہے وہ غنی ہے' اس سے زکوٰۃ لی جائے گی۔ اور جو اس لکیر سے نیچے رہ گیا ہے وہ فقیر ہے اور زکوٰۃ لینے کا حق دار ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ))(۱) ''ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء میں لوٹا دی جائے گی''۔

دنیا میں اس وقت جو معاشرے ہیں ان میں انگریزوں کا معاشرہ بڑا منفرد (unique) ہے۔ ایک طرف تو روایت پرستی اس قوم کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ہر نئی چیز کے لیے آنکھیں اور کان کھلے بھی رکھتے ہیں۔ جو نئی بات آئے گی اس پر کھلے دل سے غور کریں گے' سوچیں گے اور اس میں جو اچھا پہلو ہو گا لے لیں گے۔ جیسے عربی میں کہا جاتا ہے: ''خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ!'' مثلاً انسانیت نے بادشاہت سے جمہوریت تک کا جو سفر طے کیا ہے اس میں خون کسی اور نے دیا انقلاب کہیں اور آیا'

(۱) صحيح البخاری' كتاب الزكاة' باب وجوب الزكاة۔وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب الدعاء الى الشهادتين و شرائع الاسلام۔

*

خون کی ندیاں کہیں اور بہیں لیکن بہترین جمہوریت کون لے گیا؟ انگریز! اس کے باوجود وہاں بادشاہت بھی برقرار ہے۔ گویا روایت کی روایت بھی برقرار رہی اور جمہوریت کی جمہوریت بھی قائم ہوگئی۔ بالشویک انقلاب روس میں آیا' خون ریزی وہاں ہوئی' سوشلسٹ معیشت کا تجربہ وہاں ہوا' لیکن سوشلزم اور سرمایہ داری کا امتزاج ہو رہا ہے برطانیہ میں! گزارہ الاؤنس (subsistence allowance) برطانیہ میں دیا جا رہا ہے' لیکن ساتھ ہی آزادی بھی برقرار ہے۔ اگر آپ بے روزگار ہیں تو ریاست آپ کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دے گی اور وہ آپ کو مہیا کرے گی۔

مستقبل کا نظریۂ حیات

یہ اصل میں وہ synthesis ہے جو اپنے آخری نقطۂ عروج پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا۔ انسان ٹھوکریں کھا کر' بڑی خونریزیوں کے بعد لامحالہ وہیں پہنچے گا' یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کہیں اور جائے۔ یہی خیال ہے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا' جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب ''Ideology of the Future'' میں کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقبل کا نظریۂ حیات اسلام ہے۔ نوعِ انسانی چار و ناچار اُدھر جا رہی ہے' لیکن وہ ٹھوکریں کھا کر' دھکے کھا کر جائے گی' خونریزیوں کے بعد جائے گی' مختلف تجربے کرے گی اور ان تجربوں سے نمعلوم کتنا کچھ نقصان ہوگا۔ تاہم چار و ناچار وہیں پہنچے گی۔ بقول اقبال:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

چین کے وزیراعظم کی بیٹی سائیکل پر سکول جاتی ہے تو اپنی جگہ یہ واقعی ایک قابل تعریف بات ہے۔ لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ دنیا کو اس مساوات سے کس نے آشنا کیا؟

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس

اب ذرا اس مساوات کو دیکھئے جس کی نظیر انسانی تاریخ نہ اب تک پیش کر سکی ہے اور نہ قیامت تک پیش کر سکتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ہے۔ مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ شہر کی فصیلیں بڑی مضبوط ہیں۔ شہر اپنی ضروریات میں خود کفیل ہے۔ اندر راشن اور پینے کا پانی وافر موجود ہے۔ اہل شہر کے لیے کوئی خاص دقت نہیں تھی، فصیلیں اور دروازے بند کیے بیٹھے ہیں۔ محاصرہ طول پکڑتا ہے تو ان کے پادری سفید جھنڈا لیے ہوئے فصیل پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: مسلمانو! تم قیامت تک بھی یہاں پڑے رہو گے تو شہر فتح نہیں ہوگا۔ ہاں! ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ شہر ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اس کے کچھ اوصاف اور کچھ علامات ہمارے ہاں لکھی ہوئی ہیں، تم میں ہمیں ویسا کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ سن کر امیر جیش حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ بادشاہ تو عمرؓ ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے کے لیے عرضداشت بھیجی گئی۔ اس پر آپؓ تشریف لائے۔ پادریوں نے کہا تھا کہ اگر وہ درویش بادشاہ خود آ جائے تو ہم اس کے لیے شہر کے دروازے کھول دیں گے اور شہر کا انتظام اس کے حوالے کر دیں گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سفر بیت المقدس کوئی ذاتی سفر نہ تھا بلکہ انتہائی اہم سرکاری دورہ تھا۔ مدینہ منورہ سے بیت المقدس سینکڑوں میل کا سفر ہے، لیکن اس سفر میں خلیفۂ وقت کے ہمراہ نہ کوئی لاؤ لشکر تھا، نہ خدم وحشم اور نہ کوئی سیکریٹری اور نہ باڈی گارڈ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ صرف ایک غلام تھا اور سواری کے لیے ایک اونٹنی۔ اس عالم میں سفر ہو رہا ہے کہ ایک منزل عمرؓ اونٹنی پر سوار ہوتے ہیں اور نکیل غلام کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جبکہ اگلی منزل میں غلام سوار ہوتا ہے اور عمرؓ مہار پکڑے پیدل چل رہے ہوتے ہیں۔ جب بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں تو غلام درخواست کرتا ہے کہ آپ اونٹنی پر سوار ہو جائیں، لیکن آپؓ فرماتے ہیں کہ نہیں، سوار ہونے کی باری تمہاری ہے۔ یہ ہے مساوات! یہ دنیا دس بار ختم ہو کر پھر پیدا ہو لے تو بھی اس مساوات کے آس پاس کی

*

مثال بھی پیش نہیں کر سکتی۔ جس طرح محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا کوئی مثل ممکن نہیں ہے اسی طرح خلافتِ راشدہ کی بھی مثال ممکن نہیں ہے۔

ہمارا معیار اور آئیڈیل

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتقال پر ایک بات کہی تھی کہ اے ابوبکرؓ! تم اپنے بعد آنے والوں کے لیے بڑی سختی پیدا کر گئے' ایسا معیار قائم کر گئے جس پر پورا اترنا آسان نہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہ معیار قائم کیا جس کی نظیر ممکن نہیں۔ بہرحال ہمارا معیار اور آئیڈیل یہی نظام ہے جو یہ حضرات قائم کر گئے۔ یہ پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں' یہ تاریخی حقائق ہیں۔ یہ نظام قائم ہوا ہے' بالفعل قائم ہوا ہے' دنیا کی شہادت ہے کہ قائم ہوا ہے۔ اس شہادت کی ایک صدائے بازگشت اس صدی کے آغاز میں مہاتما گاندھی کی زبان سے اُس وقت بلند ہوئی جب کانگرس کی صوبائی وزارتیں تشکیل پائی تھیں۔ اُس وقت مہاتما گاندھی نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس نے کسی اشوک' بکرماجیت' چندر گپت موریا اور رام چندر کی مثال پیش نہیں کی۔ مثال پیش کی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی۔ یہ ہے میری گفتگو کا موضوع' جسے میں نے ع ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!'' کے مصداق شاید ذرا زیادہ پھیلا دیا۔ بہرحال یہ ہے اتمامِ حجت' یہ ہے بعثتِ انبیاء ورُسل علیہم السلام کی غرض وغایت اور یہ ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ختمِ نبوت کا تقاضا۔ ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے پوری انقلابی جدوجہد محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے کی اور پھر اس کے خلاف اٹھنے والی مزاحمتی اور مخالفانہ قوتوں سے خلیفۂ کامل' خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبرد آزما ہوئے اور بالکل ایک مستحکم معاشرہ دے کر رخصت ہوئے۔ اب اس کھیت میں جس میں ہل چل چکے تھے' کاشت کاری ہوئی' اور دورِ فاروقی وعثمانی میں نوعِ انسانی کے لیے نظامِ عدلِ اجتماعی کے عملی نمونے کی صورت میں ایک لہلہاتی فصل جملہ برکات کے ساتھ ظہور میں آئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمینOO

*

تعمیرِ سیرت

طہارت و نظافتِ نبویؐ

عتیق الرحمٰن صدیقی

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو نبوت کے مقامِ رفیع پر متمکن فرمایا اور کہا کہ اٹھئے اور لوگوں کو خبردار کیجیے اور اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کیجیے۔ ایک عظیم منصب پر فائز کیے جانے کا اقتضاء یہ تھا کہ ایک صالح اور پاکیزہ فکر کے ساتھ آپؐ کا ہر عمل راست روی اور صحت و سلامتی کا عکاس ہو۔ اللہ جمیل ہے تو اس کا جمال فکر و عمل میں بھی پوری طرح ہویدا ہو، دامن بھی اجلا ہو اور لباس بھی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو، اس لیے کہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی لازم و ملزوم ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں رہ سکے۔ نبی اکرم ﷺ جس معاشرے کی اصلاح و تطہیر کے لیے مبعوث ہوئے، بالفاظِ دیگر وہ لوگ جو آپؐ کے اوّلین مخاطب تھے، وہ نہ صرف فکری کج روی کا شکار تھے بلکہ متعدد اخلاقی خرابیوں میں بھی مبتلا تھے۔ وہ طہارت و نظافت کے ابتدائی تصورات سے بھی ناآشنا تھے، انہیں پاکیزگی کا سبق سکھانا ضروری تھا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کو بھی اپنی ظاہری زندگی میں طہارت کا اعلیٰ معیار قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

> ''یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضور ﷺ نے نوعِ انسانی کو طہارت جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو طہارت کا ہم معنی ہو''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم)

نفاست و نظافت رسول اللہ ﷺ کے مزاج میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ آپؐ نے ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھولیا کرے؟ (ابوداؤد) ایک دفعہ ایک آدمی خراب کپڑے پہنے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے؟ بولا ہاں! ارشاد ہوا خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ (ابوداؤد)

عربوں میں تہذیب وشائستگی کم تھی' اپنے گنوار پن کی بدولت عجیب عجیب حرکتیں کر جاتے تھے' صفائی وستھرائی کا وہ قرینہ موجود نہ تھا جو خوش اطوار لوگوں کا خاصّہ ہوتا ہے۔ مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے۔ رسول اللہ ﷺ اس حرکت کو سخت ناپسند فرماتے اور دیواروں سے تھوک کے دھبوں کو چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹا دیتے۔ ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا' ایک انصاری عورت نے دھبے کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لا کر ملی' آپؐ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین فرمائی۔ (نسائی) رسول اللہ ﷺ کو خوشبو بہت پسند تھی' ہدیہ کے طور پر کوئی خوشبو بھیجتا تو ردّ نہ فرماتے بلکہ قبول کر لیتے۔ ایک خاص قسم کی خوشبو جس کو سکہ کہتے ہیں' آپؐ ہمیشہ استعمال فرماتے۔ کبھی مجلس عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں بھی جلائی جاتیں جن میں کبھی کبھی کافور ہوتا۔ آپؐ اکثر مشک وعنبر کا استعمال بھی فرماتے۔

مسجد نبویؐ تنگ تھی' بعض اوقات کاروباری لوگ میلے کپڑوں کے ساتھ مسجد میں آ جاتے' ان کے پسینہ سے مسجد میں بو پھیل جاتی۔ ایک دفعہ جب بو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا۔ اسی دن سے غسل جمعہ کا اہتمام شرعی حکم کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ آپؐ نے ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ بالوں کو درست کرے! آپؐ نے جب ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی' پسینہ آیا تو اتار کر رکھ دی۔ آپؐ بودار چیزوں مثلاً کچے پیاز' لہسن وغیرہ کے استعمال پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص پیاز اور لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس نے یہ چیزیں ضرور ہی استعمال کرنی ہوں وہ پکا کر اِن کی بو ختم کر لے۔ ایک شخص نے نماز کی امامت کے دوران تھوک دیا' آپ ﷺ مشاہدہ فرما رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ شخص نماز نہ پڑھائے۔ نماز کے بعد وہ شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ کیا آپؐ نے یہ حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ: ''ہاں' تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی۔'' مسجد نبویؐ میں جھاڑو دینے کا التزام تھا' اُمّ محجن نام کی ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی۔

طہارت اور صفائی خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبۃ) ''اور اللہ طہارت اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔ اور: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ (المائدۃ:٦) ''اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک

*

ہو جایا کرو‘‘۔ اگر پانی میسر نہ آ سکے یا کسی مرض کے سبب پانی کا استعمال نقصان دہ ہو تو پاک مٹی سے تیمّم کر لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (المائدۃ:٦) ’’تو پاک مٹی سے تیمّم کر لو‘‘۔ بارگاہِ ربّ العزت میں نماز کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے وضو کرنے کا حکم دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدۃ:٦) ’’اے ایمان والو! جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ‘‘۔ جمعۃ المبارک کے دن پاک صاف ہو کر اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہونے کا حکم دیا گیا‘ تاکہ کسی کی گندگی اور بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجاء کو ضروری قرار دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھو لے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے‘ کیونکہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے‘‘ (مسلم) پر لطف نیند کا مزہ پاکیزہ ماحول میں ہی میسر آ سکتا ہے‘ جب کہ جسم‘ کپڑے اور خواب گاہ صاف ستھرے ہوں‘ بدن ہر قسم کی نجاستوں اور آلائشوں سے پاک ہو۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’جس کے ہاتھ میں چکنائی وغیرہ لگی ہو اور وہ اسے صاف کیے بغیر سو گیا اور اس کی وجہ سے اسے کوئی نقصان پہنچا‘ یعنی کسی جانور نے کاٹ لیا تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے کہ وہ بغیر دھوئے کیوں سو گیا‘‘ (ابوداؤد) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو پہلے اس طرح وضو کرو جیسے نماز کے لیے وضو کرتے ہو‘‘۔ (بخاری)

صحت مند رہنے کے لیے دانتوں کی صفائی نہایت ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دانت صاف کرنے پر نہ صرف زور دیا بلکہ اس کا باقاعدہ اہتمام فرمایا‘ مسواک کرنا سنت ٹھہرایا۔ آپؐ نے فرمایا: ((لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِىْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ)) (بخاری و مسلم) ’’اگر میری اُمت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا‘‘۔ ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو آپؐ نے فرمایا: ’’میں تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں‘ مسواک کیا کرو‘‘۔ (مسند احمد)

نبی کریم ﷺ پر نزع کی حالت طاری ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپؐ کو سہارا

دینے کے لیے آپؐ کے پس پشت بیٹھی تھیں۔ آپؓ روایت کرتی ہیں: ''میں معوّذتین پڑھ کر آپؐ پر دم کرنے لگی کہ آپؐ نے اوپر کی طرف نظر اٹھالی اور فرمایا: ((فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی، فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی)) (سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس، سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس)۔ اتنے میں حضرت عائشہؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ حاضر ہوئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بہ نظر رغبت ان کی طرف دیکھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھ گئیں کہ آپؐ کو مسواک کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بھائی سے مسواک لے کر پہلے خود اُس کو چبا کر نرم کیا اور پھر آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھمادی۔ آپؐ نے بہت اچھی طرح مسواک کی جیسے آپؐ تندرستی کی حالت میں کیا کرتے تھے۔ مسواک سے فارغ ہوکر آپؐ اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو واپس کرنے لگے لیکن وہ آپؐ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی''۔ (سیرت طیبہ رحمت دارینؐ)

رسول اللہ ﷺ کی نفاست و لطافت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے عالم فانی میں آخری دن اور پھر نزع کے وقت بھی مسواک کرنا ضروری سمجھا۔ آپؐ رات کو تین بار مسواک فرماتے، سونے سے پہلے، تہجد کے لیے بیدار ہوکر اور صبح کو جب نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔

نبی کریم ﷺ نے عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت سے منع فرمایا تاکہ درخت کے سایہ میں چند ساعتیں بیٹھ کر ستانے والوں کو اس نجاست سے پریشانی لاحق نہ ہو۔ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا تاکہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر نہ پڑنے پائیں، اس طرح نہ صرف یہ کہ ستر قائم نہیں رہتا بلکہ تہذیب و وقار کو بھی دھچکا لگتا ہے۔ غسل خانہ کی زمین پر پیشاب کرنے سے روکا خصوصاً جبکہ وہ جگہ کچی ہو۔ بول و براز کے بعد استنجاء کو ضروری ٹھہرایا، ڈھیلے وغیرہ سے صفائی کے بعد پانی کے استعمال کو پسندیدہ سمجھا۔ یہ بھی فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے استنجاء کیا جائے اور پھر ہاتھ دھولیے جائیں۔ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن قرار دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کا پسینہ گویا موتی ہوتا تھا اور حضرت اُمّ سُلیم کہتی ہیں کہ یہ پسینہ ہی عمدہ خوشبو ہوا کرتی تھی۔ (مسلم) آپؐ جب کسی راستے سے تشریف لے جاتے اور آپؐ کے بعد کوئی اور گزرتا تو آپؐ کے جسم یا پسینہ کی خوشبو کی وجہ سے جان جاتا کہ آپؐ یہاں سے تشریف لے گئے ہیں۔ (مشکوٰۃ) اس عنبرین پسینہ کے باوجود اُون کی چادر پہنے ہوئے جب آپؐ کو پسینہ آیا تو چادر اتار کر رکھ دی۔

*

رسول اللہ ﷺ نے طہارت و نظافت کو ہر لحظہ ملحوظ رکھا۔ آپؐ کو ہر اُس چیز سے نفور تھا جس سے ایک شائستہ و شستہ مزاج آدمی کو نفور ہوتا ہے اور ایک سلیم الطبع آدمی کو جس سے گھن آتی ہے' مگر سادگی و بے تکلفی بھی ہمیشہ پیش نظر رہی۔ آپؐ کا لباس سادہ اور صاف ستھرا ہوتا تھا۔ گاہے آپؐ نے قیمتی کپڑے کا لباس بھی زیب تن فرمایا لیکن عام طور پر آپؐ کا لباس سوتی کپڑے کا ہوتا تھا۔ کتان اور صوف بھی آپؐ نے پہنا ہے۔ امام غزالی کا بیان ہے کہ آپؐ کے پاس زعفران سے رنگی ہوئی ایک بہت بڑی چادر تھی' کبھی صرف اسی کو اوڑھ پہن کر لوگوں کو نماز پڑھا دیتے تھے۔

نبی کریم ﷺ نے ایسی تعلیم نہیں دی جو تشدد و غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں دیگر مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف:۱۵۷) ''وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے 'بدی سے روکتا ہے' ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور اُن پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے''۔ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے' کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجاء کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہودیوں کے ہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۲۲) ''(اے نبیؐ) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں حیض کا حکم کیا ہے؟ کہو وہ ایک گندگی (کی حالت) ہے' پس حیض (کی حالت) میں عورتوں سے الگ رہو اور اُن کے قریب نہ جاؤ جب تک وہ پاک صاف نہ ہو جائیں' پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے''۔ گویا فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ یہ کہ حائضہ عورتوں کو بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے۔ حضرت

عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کے بالوں کو کنگھی کرتی تھی اور آپؐ کے سر کو دھوتی تھی۔ ایک بار آپؐ نے مجھ سے کوئی چیز مانگی' میں نے معذرت کی تو فرمایا: ''یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے''۔ (مسلم) ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان نجس نہیں ہوتا''۔ (ابوداؤد) یعنی مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا نجس نہیں ہوتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔ البتہ ناپاکی کی حالت میں مسجد میں جانا اور قرآن مجید کو چھونا جائز نہیں۔

سورۃ المدثر میں اللہ نے یہ جو فرمایا: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾ ''اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دُور رہو''۔ سید مودودیؒ نے اس ارشاد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے' اگر کوئی ذرا اجلے کپڑے پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو مگر اُس میں فخر و غرور' ریا اور نمائش' ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو..... ابنِ عباسؓ' ابراہیم نخعی' شعبی' عطاء' مجاہد' قتادہ' سعید بن جبیر' حسن بصری رحمہم اللہ اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ ''اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو''۔ اور ''گندگی سے دور رہو'' کے ضمن میں انہوں نے لکھا کہ ''گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے خواہ وہ عقائد و خیالات کی ہو' یا اخلاق و اعمال کی یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو اُن میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے''۔ (تفہیم القرآن' جلد ششم' حاشیہ ۴' ۵)

لباس انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ اور ایک بنیادی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام کو جنت میں عمدہ اور نفیس لباس عطا کیا تھا' شیطان نے انہیں دھوکا دیا اور وہ اس عظیم

*

نعمت سے محروم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اعلان کیا کہ: ﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ﴾(الاعراف:۲۶) ''اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو' اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے''۔ گویا لباس کا اہم مقصد ستر پوشی ہے اور دوسرا مقصد انسانی جسم کی زیب و زینت اور حسن و جمال کو قائم رکھنا' بلکہ اس میں اضافہ کرنا ہے' اور تیسرا مقصد موسموں کے تکلیف دہ اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ بہترین لباس وہ ہے جس سے طہارت و نظافت کے تقاضے پورے ہوتے ہوں اور اس سے مذکورہ بالا اخلاقی' روحانی اور جسمانی ضروریات بدرجۂ اَتم تکمیل پاتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعے لباس کے بارے میں ایسے آداب مقرر فرمائے ہیں جن کی پابندی سے قرآنی اغراض و مقاصد بحسن وخوبی پورے ہوتے ہیں۔ ایک احسان شناس اور سلیم الفطرت آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے اپنے آپ کو فیض یاب کرے اور ان حدود و قیود کی پاسداری بھی کرے جو اس نے اپنے بندوں کے فائدے کے لیے متعین فرمائی ہیں۔ حضرت ابوالاحوص رضی اللہ عنہ کے والد اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اُس وقت میرے جسم پر نہایت گھٹیا اور معمولی کپڑے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: ''کیا تمہارے پاس مال و دولت ہے؟'' میں نے کہا ''خدا نے مجھے ہر قسم کا مال دے رکھا ہے' اونٹ' گائے' بکریاں اور غلام سب کچھ موجود ہیں''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''جب خدا نے تمہیں دولت سے نواز رکھا ہے تو اس کے فضل و احسان کے آثار تمہارے جسم پر ظاہر ہونے چاہئیں۔'' (مشکوٰۃ) حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کی وساطت سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمتوں کے آثار دیکھ کر خوش ہوتا ہے''۔ (ترمذی)

اخذ و استفادہ:

☆ تفہیم القرآن' جلد دوم و ششم
☆ سیرت النبی ﷺ از شبلی نعمانی' جلد دوم و ششم
☆ رحمت دارین ﷺ' طالب الہاشمی
☆ الرحیق المختوم' صفی الرحمٰن مبارک پوری
☆ الرشید (سیرت نمبر) ۱۹۹۱ء

خواتین کی اصل عظمت اور حقوق

احادیث مبارکہ کی روشنی میں

(گزشتہ سے پیوستہ)

انجینئر نوید احمد☆

ماں کی حیثیت سے احترام

ماں کے تقدس کے بیان میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے:

((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ))(٤٦)

''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے''۔

یہ بات ایک اور روایت میں یوں بیان ہوئی:

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ جَاهِمَةَ السَّلَمِيَّ اَنَّ جَاهِمَةَ جَآءَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرَدْتُّ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ، فَقَالَ: ((هَلْ لَّكَ مِنْ اُمٍّ؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا)) (٤٧)

حضرت معاویہ بن جاہمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد حضرت جاہمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ارادہ جہاد میں جانے کا ہے اور میں آپ ﷺ سے اِس بارے میں مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا: ''کیا تمہاری ماں ہے؟'' اُنہوں نے عرض کیا: ہاں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر اُس کے پاس اور اُس کی خدمت میں رہو، جنت اُس کے قدموں میں ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے کئی ارشادات میں ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کی نصیحت فرمائی۔

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر، قرآن اکیڈمی کراچی

حدیث مبارکہ ملاحظہ ہو:

جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ؟ قَالَ: ((اُمُّکَ)) قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ اُمُّکَ)) قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ اُمُّکَ)) قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ اَبُوْکَ))(۴۸)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میری طرف سے خدمت اور حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''تیری والدہ''۔ اُس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''پھر بھی تیری والدہ''۔ اُس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''پھر بھی تیری والدہ''۔ اُس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تیرے والد''۔

یہ حدیثِ مبارکہ خاندانی نظام میں ایک حسین توازن پیدا کر دیتی ہے۔ خاندان میں قانونی اعتبار سے والد کو فوقیت حاصل ہے۔ وہ خاندان کا سربراہ ہے' لہٰذا خاندان میں بیوی اور اولاد پر' شرعی حدود کے اندر' اُس کی اطاعت لازم ہے۔ البتہ توازن پیدا کرنے کے لیے اخلاقی اعتبار سے ماں کے ساتھ حسنِ اخلاق کو والد کی نسبت تین گنا زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((نُمْتُ فَرَاَیْتُنِیْ فِی الْجَنَّةِ فَسَمِعْتُ قَارِئًا یَقْرَأُ فَقُلْتُ مَنْ ھٰذَا؟ قَالُوْا: حَارِثَةُ بْنُ النُّعْمَانِ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: کَذٰلِکَ الْبِرُّ' کَذٰلِکَ الْبِرُّ' کَذٰلِکَ الْبِرُّ' قَالَ: وَکَانَ اَبَرُّ النَّاسِ بِاُمِّہٖ))(۴۹)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں سویا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں ہوں' وہیں میں نے کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی تو میں نے دریافت کیا کہ اللہ کا یہ کون بندہ ہے (جو یہاں جنت میں قرآن پڑھ رہا ہے)؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ ہیں''۔ اِس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(ماں کی خدمت) ایسی ہی نیکی ہے' ایسی ہی نیکی ہے' ایسی ہی نیکی ہے''۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ''حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کے معاملے میں سب سے زیادہ نیک تھے (یعنی اِس عمل نے اُن کو اُس مقام تک پہنچایا کہ جنت میں اُن کی قراءت سنی گئی)''۔

فِیْ حَدِیْثِ اَبِیْ رِمْثَۃٍ اِنْتَھَیْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہ ﷺ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ: ((بَرَّ اُمَّکَ وَاَبَاکَ، ثُمَّ اُخْتَکَ وَاَخَاکَ، ثُمَّ اَدْنَاکَ اَدْنَاکَ))

''حضرت ابو رمثہؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ اُنہوں نے بیان کیا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''تو اپنی ماں کے ساتھ اور اپنے باپ کے ساتھ، اور اپنی بہن کے ساتھ اور اپنے بھائی کے ساتھ حسنِ سلوک کر، اِن کے بعد جو رشتہ دار زیادہ قریب ہوں اُن کے ساتھ حسن سلوک کر''۔

رسول اللہ ﷺ نے مشرک ماں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیا:

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّیْ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ فِیْ عَھْدِ قُرَیْشٍ ..... فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّیْ وَھِیَ رَاغِبَۃٌ اَفَاَصِلُ اُمِّیْ؟ قَالَ : ((نَعَمْ صِلِیْ اُمَّکِ))(۵۰)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور قریش مکہ کے (حدیبیہ والے) معاہدے کے زمانہ میں میری ماں جو اپنے مشرکانہ مذہب پر قائم تھی، (سفر کر کے مدینے میں) میرے پاس آئی تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ کچھ خدمت کی خواہش مند ہے، تو کیا میں اُس کی خدمت کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، اپنی ماں کی خدمت کرو (اور اُن کے ساتھ وہی سلوک کرو جو بیٹی کو ماں کے ساتھ کرنا چاہیے)''۔

اِسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ماں کی نافرمانی سے باز رہنے کی بڑی تاکید کے ساتھ تلقین فرمائی:

((اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَمَنْعًا وَھَاتِ وَوَاْدَ الْبَنَاتِ، وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ))(۵۲)

''بے شک اللہ نے تم پر حرام کر دیا ہے ماؤں کی نافرمانی کرنا، ضرورت کے موقع پر خرچ نہ کرنا اور بچیوں کو زندہ درگور کر دینا۔ اور اُس نے تمہارے لیے ناپسند کیا ہے فضول بحث و گفتگو، کثرتِ سوال اور مال کے ضائع کرنے کو''۔

خالہ کا تقدس

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْخَالَۃُ بِمَنْزِلَۃِ الْاُمِّ)) (۵۳)

''خالہ ماں کے درجے پر فائز ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَجُلاً أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنِّيْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا' فَهَلْ لِيْ تَوْبَةٌ؟ قَالَ : ((هَلْ لَّكَ مِنْ أُمٍّ؟)) قَالَ لاَ' قَالَ: ((هَلْ لَّكَ مِنْ خَالَةٍ؟)) قَالَ نَعَمْ' قَالَ: ((فَبِرَّهَا)) (٥٤)

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے' تو کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟'' اُس نے عرض کیا کہ ماں تو نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کیا تمہاری کوئی خالہ ہے؟'' اُس نے عرض کیا کہ ہاں خالہ موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اُس کی خدمت اور اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرو (اللہ تعالیٰ اِس کی برکت سے تمہاری توبہ قبول فرمالے گا اور تمہیں معاف فرمادے گا)''۔

بیٹی کے لیے شفقت

بیٹیاں اللہ کی رحمت ہیں' کیونکہ وہ جہنم سے بچاؤ اور حصولِ جنت کا ذریعہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مبارک ارشادات ہیں:

((مَنْ كَانَ لَهُ ثَلاَثُ بَنَاتٍ فَصَبَرَ عَلَيْهِنَّ وَأَطْعَمَهُنَّ وَسَقَاهُنَّ وَكَسَاهُنَّ مِنْ جِدَتِهِ كُنَّ لَهُ حِجَابًا مِّنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (٥٥)

''جس کی تین بیٹیاں ہوں' پھر وہ اُن پر صبر کرے اور اُن کو اپنی حیثیت کے مطابق کھلائے' پلائے اور لباس پہنائے تو وہ روزِ قیامت اُس کے لیے جہنم سے بچنے کا ذریعہ بن جائیں گی''۔

((مَنْ عَالَ ثَلاَثَ بَنَاتٍ فَأَنْفَقَ عَلَيْهِنَّ وَرَحِمَهُنَّ وَاَحْسَنَ اَدَبَهُنَّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ)) قِيْلَ : اَوِ اثْنَتَيْنِ؟ قَالَ : ((اَوِ اثْنَتَيْنِ)) (٥٦)

''جس کی تین بیٹیاں ہوں' پھر وہ اُن کے اخراجات برداشت کرے' اُن کے ساتھ رحم اور شفقت کا برتاؤ کرے اور اُن کو اچھا ادب سکھائے تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائے گا''۔ پوچھا گیا کہ اگر کسی کی دو بیٹیاں ہوں تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر دو بھی ہوں (تب بھی یہی اجر ملے گا)''۔

((مَنْ كُنَّ لَهُ ثَلاثُ بَنَاتٍ يُؤْوِيهِنَّ وَيَرْحَمُهُنَّ وَيَكْفُلُهُنَّ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ الْبَتَّةَ)) قَالَ قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَإِنْ كَانَتِ اثْنَتَيْنِ؟ قَالَ : ((وَإِنْ كَانَتِ اثْنَتَيْنِ)) قَالَ : فَرَاٰى بَعْضُ الْقَوْمِ أَنْ لَوْ قَالُوْا لَهُ وَاحِدَةً لَقَالَ وَاحِدَةً(۵۷)

''جس کی تین بیٹیاں ہوں، وہ اُنہیں اچھی طرح سے رکھے، اُن کے ساتھ رحم اور شفقت کا برتاؤ کرے اور اُن کی پرورش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت واجب فرما دیں گے''۔ ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر دو لڑکیاں ہوں (جن کی پرورش کی ہو) تو اِس بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اُس کے لیے بھی یہی فضیلت ہے''۔ راوی کہتے ہیں اگر ایک لڑکی کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ ﷺ اُس کے لیے بھی یہی فضیلت بیان فرماتے''۔

رسول اللہ ﷺ نے دو بیٹیوں کے حوالے سے بھی بشارتیں عطا فرمائیں:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ)) وَضَمَّ أَصَابِعَهُ (۵۸)

''جس شخص نے دو بچیوں کی پرورش و تربیت کی حتیٰ کہ وہ بالغ ہو گئیں، روزِ قیامت وہ اِس حال میں آئے گا کہ میں اور وہ اس طرح (ساتھ ساتھ) ہوں گے'' اور آپ ﷺ نے اپنی (درمیانی اور شہادت والی) انگلیاں ملا دیں''۔

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ دَخَلْتُ أَنَا وَهُوَ الْجَنَّةَ كَهَاتَيْنِ)) وَأَشَارَ بِإِصْبُعَيْهِ(۵۹)

'' جس نے دو بیٹیوں کی پرورش کی تو میں اور وہ ان دو انگلیوں کی طرح جنت میں داخل ہوں گے'' اور آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (شہادت اور درمیان والی) سے اشارہ فرمایا۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَتِ امْرَأَةٌ مَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا تَسْأَلُ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِيْ شَيْئًا غَيْرَ تَمْرَةٍ فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا وَلَمْ تَأْكُلْ مِنْهَا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيْنَا فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ ﷺ: ((مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ))(۶۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک عورت کچھ مانگنے کے لیے آئی اور اُس کے ساتھ اُس کی دو بیٹیاں تھیں۔ میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ اور نہ تھا۔

میں نے وہی اُسے دے دی۔ اُس نے اُسے تقسیم کر کے اپنی دونوں بچیوں کو دیا اور خود کچھ نہ کھایا۔ پھر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ جب نبی اکرم ﷺ ہمارے پاس آئے تو میں نے اُنہیں اِس واقعہ سے آگاہ کیا۔ اِس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس پر اللہ تعالیٰ اِن بچیوں کی کچھ آزمائش ڈالتا ہے (اور وہ اُن سے حسنِ سلوک کرتا ہے) تو وہ اُس کے لیے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ بن جائیں گی''۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ: جَاءَتْنِیْ مِسْكِيْنَةٌ تَحْمِلُ ابْنَتَيْنِ لَهَا، فَأَطْعَمْتُهَا ثَلَاثَ تَمَرَاتٍ فَأَعْطَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا تَمْرَةً وَرَفَعَتْ اِلٰى فِيْهَا تَمْرَةً لِتَأْكُلَهَا فَاسْتَطْعَمَتْهَا ابْنَتَاهَا، فَشَقَّتِ التَّمْرَةَ الَّتِیْ كَانَتْ تُرِيْدُ أَنْ تَأْكُلَهَا بَيْنَهُمَا فَأَعْجَبَنِیْ شَأْنُهَا، فَذَكَرْتُ الَّذِیْ صَنَعَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: ((اِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَوْجَبَ لَهَا بِهَا الْجَنَّةَ أَوْ أَعْتَقَهَا بِهَا مِنَ النَّارِ))[٦١]

حضرت عائشہ ؓ بیان فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک مسکین عورت اپنی دو بیٹیاں اٹھائے ہوئے آئی، میں نے اُسے کھانے کے لیے تین کھجوریں دیں، پس اُس نے دو کھجوریں تو اپنی دو بیٹیوں کو دے دیں اور ایک کھجور کھانے کے لیے اپنے منہ کی طرف بڑھا رہی تھی کہ وہ بھی اُس سے اُس کی بیٹیوں نے مانگ لی۔ چنانچہ اُس نے وہ کھجور بھی، جسے وہ خود کھانا چاہتی تھی، دو حصے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی۔ مجھے اُس کی یہ بات بڑی اچھی لگی۔ میں نے اِس واقعہ کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اُس کے اِس عمل کی وجہ سے اُس کے لیے جنت واجب فرما دی ہے —— یا یہ فرمایا کہ اُسے جہنم کی آگ سے آزاد کر دیا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک بیٹی کی پرورش پر بھی خوشخبری دی:

((مَنْ وُّلِدَتْ لَهُ ابْنَةٌ فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا يَعْنِی الذَّكَرَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ بِهَا الْجَنَّةَ)) [٦٢]

''جس شخص کے ہاں بیٹی پیدا ہو اور پھر وہ نہ تو اُسے کوئی ایذا پہنچائے، نہ اُس کی توہین و ناقدری کرے اور نہ لڑکے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ اسے اُس کے بدلے جنت میں داخل کرے گا''۔

رسول اللہ ﷺ نے بیٹے اور بیٹی کے درمیان مساوات قائم رکھنے کی تلقین فرمائی:

((سَوُّوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ ، فَلَوْكُنْتُ مُفَضِّلاً اَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ)) (٦٣)

''تحائف دینے میں اپنی سب اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا معاملہ کرو۔ اگر میں اِس معاملہ میں کسی کو ترجیح دیتا تو عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو ترجیح دیتا (یعنی مساوات اور برابری ضروری نہ ہوتی تو میں حکم دیتا کہ لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ دیا جائے)''۔

اس حدیث کی روشنی میں فقہاء کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص زندگی ہی میں اپنا ترکہ اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تو اُسے بیٹے اور بیٹی کو مساوی حصہ دینا چاہیے۔

بہن کے ساتھ حسنِ سلوک

بیٹیوں کی طرح بہنوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی ہدایت کئی احادیثِ مبارکہ میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً :

((مَنْ عَالَ ثَلاثَ بَنَاتٍ فَأَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ ـــــ قَالَ : ثَلاثُ اَخَوَاتٍ اَوْ ثَلاثُ بَنَاتٍ اَوْ بِنْتَانِ اَوْ اُخْتَانِ)) (٦٤)

''جس بندے نے تین بیٹیوں کا بار اٹھایا' اور اُن کی اچھی تربیت کی' اور اُن کا نکاح کر دیا اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اُس کے لیے جنت ہے ـــ (اس سند سے یہ بھی مروی ہے کہ) چاہے تین بہنیں ہوں' یا تین بیٹیاں ہوں' یا دو بیٹیاں ہوں یا دو بہنیں ہوں''۔

((مَنْ كَانَ لَهُ ثَلاثُ بَنَاتٍ أَوْ ثَلاثُ أَخَوَاتٍ أَوِ ابْنَتَانِ أَوْ اُخْتَانِ فَأَحْسَنَ صُحْبَتَهُنَّ وَاتَّقَى اللّٰهَ فِيهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ)) (٦٥)

''جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں تھیں اور اُس نے اچھی طرح اُن کی پرورش کی' پھر اِس دوران ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرتا رہا تو اُس کے لیے جنت ہے''۔

((مَنْ عَالَ ابْنَتَيْنِ أَوْ ثَلاثَ بَنَاتٍ أَوْ أُخْتَيْنِ أَوْ ثَلاثَ أَخَوَاتٍ حَتّٰى يَمُتْنَ اَوْ يَمُوْتَ عَنْهُنَّ كُنْتُ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ)) وَأَشَارَ بِأُصْبُعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى (٦٦)

''جس بندے نے دو بیٹیوں یا تین بیٹیوں یا دو بہنوں یا تین بہنوں کا بار اٹھایا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئیں یا وہ خود فوت ہو گیا تو میں اور وہ اِن دو انگلیوں کی طرح (قریب) ہوں گے'' اور آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (شہادت اور درمیان والی)

سے اشارہ فرمایا''۔

((مَنْ عَالَ ابْنَتَيْنِ أَوْ أُخْتَيْنِ أَوْ خَالَتَيْنِ أَوْ عَمَّتَيْنِ أَوْجَدَّتَيْنِ فَهُوَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ، فَإِنْ كُنَّ ثَلاَثًا فَهُوَ مُفَرِّحٌ)) (٦٧)

''جس بندے نے دو بیٹیوں یا دو بہنوں یا دو خالاؤں یا دو پھوپھیوں یا ماں اور دادی کا بار اٹھایا تو وہ میرے ساتھ جنت میں اس طرح ہوگا (آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا اپنی شہادت اور درمیان والی انگلی سے)' پھر اگر یہ خواتین تین ہوں تو وہ تو بڑا ہی خوش قسمت ہے''۔

بیوی کی حیثیت سے حقوق

نبی اکرم ﷺ نے نیک بیوی کو دنیا کی سب سے مفید نعمت قرار دیا:

((اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ)) (٦٨)

''پوری دنیا نفع حاصل کرنے کی چیز ہے اور دنیا کی چیزوں میں سب سے بہتر چیز جس سے نفع حاصل کیا جائے' نیک بیوی ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں کسی انسان کے بہتر ہونے کا معیار اُس کا اپنی بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ ترمذی شریف کی روایات ہیں:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ وَأَنَاخَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ)) (٦٩)

''(لوگو! جان لو کہ) تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ اور تم میں سے اپنے گھر والوں سے سب سے بہتر حسنِ سلوک کرنے والا میں خود ہوں''۔

((أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ خُلُقًا)) (٧٠)

''کامل ترین مؤمن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے' اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے حق میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے''۔

اِس حدیث کی رُو سے جو شخص جتنا زیادہ خوش اخلاق ہوگا وہ اتنا ہی کامل ایمان والا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کامل ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ حسنِ اخلاق کا معاملہ کرے اور حسنِ اخلاق کی اوّلین حق دار انسان کی بیوی ہے۔ ایک اور ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُّؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ)) (٧١)

''کوئی مؤمن کسی مؤمن عورت (یعنی اپنی بیوی) سے نفرت نہ رکھے' اگر اُس کی کوئی عادت یا صفت اُسے ناپسند ہے تو کوئی دوسری اُسے پسند بھی ہوگی''۔

رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کے حقوق کا ذکر اِس طرح بیان فرمایا:

عَنْ حَكِيْمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْقُشَيْرِيِّ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَا حَقُّ زَوْجَةِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((أَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ' وَتَكْسُوَهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ أَوِ اكْتَسَبْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ' وَلَا تُقَبِّحْ' وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ)) (۷۲)

حضرت حکیم بن معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں' اُنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کسی کی بیوی کا اُس پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کھاؤ اُس کو بھی کھلاؤ' اور جب تم پہنو تو اُس کو بھی پہناؤ اور یہ کہ چہرے پر نہ مارو اور برا بھلا مت کہو اور اُس کو مت چھوڑو مگر گھر ہی میں''۔

((اِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِيْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا حَتّٰى مَا تَجْعَلُ فِيْ فَمِ امْرَأَتِكَ)) (۷۳)

''تم جو کچھ بھی اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو گے اُس پر تمہیں ضرور اجر دیا جائے گا' حتیٰ کہ اُس (لقمے) پر بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے''۔

((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ فَاِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَّاِنَّ اَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ' فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ وَاِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ)) (۷۴)

''لوگو! بیویوں کے بارے میں میری وصیت مانو (یعنی اللہ کی اِن بندیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو)۔ بے شک عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے (جو قدرتی طور پر ٹیڑھی ہوتی ہے) اور زیادہ ٹیڑھ پسلی کے اوپر کے حصے میں ہوتا ہے۔ اگر تم اِس ٹیڑھی پسلی کو (زبردستی) سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر یونہی اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو پھر وہ ہمیشہ ویسی ہی رہے گی (لہٰذا ٹیڑھے پن کی صورت میں ہی اِس سے فائدہ اٹھاؤ)' اِس لیے بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی میری وصیت قبول کرو''۔

اِس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ خود کو بیوی کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اُن سے استفادہ

کرو۔ جذبات کی فراوانی‘ حسیات کی نزاکت اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اِسی فطرت پر اللہ نے اُس کو پیدا کیا ہے اور یہ اُس کے لیے عیب نہیں‘ اُس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اِسی فطرت پر قائم رکھ کر ہی اٹھا سکتے ہو۔ اگر اُس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اس میں بگاڑ پیدا کر دو گے۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں بیویوں کے حقوق کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِی النِّسَاءِ ، فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوْهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ، وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ، ولَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ، فَإِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ، وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ)) (۷۵)

’’لوگو! اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو‘ تم نے اُن کو اللہ کی امان کے ساتھ اپنے نکاح میں لیا ہے اور اُسی اللہ کے کلمہ اور حکم سے وہ تمہارے لیے حلال ہوئی ہیں۔ تمہارا اُن پر یہ حق ہے کہ جس کا (گھر میں آنا اور) تمہارے بستروں پر بیٹھنا تمہیں ناپسند ہو وہ اُس کو آ کر وہاں بیٹھنے کا موقع نہ دیں‘ پس وہ اگر ایسی غلطی کریں تو اُن کو (تنبیہہ و تأدیب کے طور پر) تم سزا دے سکتے ہو جو زیادہ سخت نہ ہو‘ اور تمہارے ذمہ مناسب طریقے سے اُن کے کھانے اور لباس کا بندوبست کرنا ہے‘‘۔

اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی یا ناروا طرزِ عمل کی شکایت ہو تو ایسی صورتِ حال میں رہنمائی رسول اللہ ﷺ کے اِس ارشاد سے لی جا سکتی ہے:

((أَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّمَا هُنَّ عَوَانٌ عِنْدَكُمْ، لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ اِلَّا أَنْ يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ، فَإِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ، فَإِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا. أَلَا اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ حَقًّا، وَلِنِسَائِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا، فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ فَلَا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُوْنَ، وَلَا يَأْذَنَّ فِیْ بُيُوْتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُوْنَ. أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ فِیْ كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ)) (۷۶)

''سنو! بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو' اس لیے کہ وہ تمہارے پاس قید ہیں اور تم اُن پر اِس کے علاوہ کوئی اختیار نہیں رکھتے کہ وہ تمہاری خواہش پوری کریں۔ (جب وہ اپنا یہ فرض ادا کر رہی ہوں تو پھر اُن کے ساتھ بدسلوکی کا جواز کیا ہے؟) ہاں اگر وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں (تو پھر تمہیں اُنہیں سزا دینے کا حق ہے)۔ پس اگر وہ ایسا کریں تو اُنہیں بستروں سے علیحدہ کر دو اور اُنہیں مارو لیکن اذیت نہ دو۔ پھر اگر وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو اُنہیں تکلیف پہنچانے کے راستے تلاش نہ کرو۔ یاد رکھو' جس طرح تمہارا حق تمہاری بیویوں پر ہے (اِسی طرح) تمہاری بیویوں کا حق تم پر ہے۔ پس تمہارا اُن پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر اُن لوگوں کو نہ بٹھائیں جنہیں تم پسند نہیں کرتے اور نہ ہی ایسے لوگوں کو گھر میں داخل ہونے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔ اور اُن کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اُنہیں بہترین کھانا کھلاؤ اور بہترین کپڑا پہننے کے لیے دو''۔ (اقتباس از خطبہ حجۃ الوداع)

اِس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے خواتین کا وصف بیان فرمایا کہ وہ تمہارے پاس تمہارے گھروں میں مقید رہتی ہیں۔ اگر مرد صرف اِس وصف پر غور کریں تو اُنہیں کبھی اُن کے ساتھ بدسلوکی کا خیال بھی نہ آئے۔ اِس حدیث میں بیوی کو اصلاح کی خاطر مارنے کی اجازت دی گئی ہے' لیکن اِس حوالے سے بھی کسی زیادتی کی اجازت نہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے:

((يَعْمِدُ أَحَدُكُمْ فَيَجْلِدُ امْرَأَتَهُ جَلْدَ الْعَبْدِ فَلَعَلَّهُ يُضَاجِعُهَا مِنْ آخِرِ يَوْمِهِ)) (۷۷)

''تم میں سے ایک آدمی اٹھتا ہے اور اپنی بیوی کو غلام کی طرح مارتا ہے۔ (اُس کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ) شاید اپنے دن کے آخر میں (یعنی رات کو) اُس کے ساتھ تعلق قائم کرے''۔

مراد یہ ہے کہ یہ بری بات ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو اِس طرح مارتا ہے جیسے آقا اپنے غلام کو مارتا ہے اور دوسری طرف اُسی سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔ یہ کتنی بداخلاقی کی بات ہے! نبی اکرم ﷺ نے ساری عمر کبھی کسی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا چاہے کتنی ناگواری کیوں نہ ہوئی ہو' اور فرمایا کہ اچھے لوگوں کا کام نہیں کہ وہ بیویوں کے ساتھ مار پیٹ کریں۔ ارشاد ہوتا ہے:

((لَقَدْ طَافَ اللَّيْلَةَ بِآلِ مُحَمَّدٍ سَبْعُوْنَ امْرَأَةً ' كُلُّ امْرَأَةٍ تَشْتَكِيْ زَوْجَهَا' فَلاَ تَجِدُوْنَ أُولٰئِكَ خِيَارَكُمْ)) (۷۸)

''آج محمد ﷺ کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکر لگایا ہے' ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی۔ (میں تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ) جن لوگوں کی تم میں سے شکایت آئی ہے وہ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں اُن کے مابین عدل کی تاکید کی اور ایسا نہ کرنے والوں کے بارے میں وعید ارشاد فرمائی:

((إِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ' فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا' جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ)) (۷۹)

''جب کسی آدمی کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ نہ کرے تو قیامت کے دن وہ اِس حالت میں آئے گا کہ اُس کے بدن کا آدھا حصہ مفلوج ہوگا''۔

بیویوں کے درمیان آپ ﷺ کے اپنے عدل کی کیفیت یہ تھی:

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْسِمُ بَيْنَ نِسَائِهِ فَيَعْدِلُ وَيَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ هٰذِهِ قِسْمَتِيْ فِيْمَا أَمْلِكُ' فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ)) (۸۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان راتیں برابر برابر تقسیم کرتے اور فرماتے: ''اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے جتنی کہ میں استطاعت رکھتا ہوں' پس مجھے ایسی چیز پر ملامت نہ کیجیے جس پر آپ قدرت رکھتے ہیں اور میں قدرت نہیں رکھتا''۔

مہر ادا کرنے کی تاکید

مہر کی ادائیگی بیوی کا حق ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اِس حق کی ادائیگی میں خیانت سے منع فرمایا ہے:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ' وَالشِّغَارُ أَنْ يُزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلٰى أَنْ يُزَوِّجَهُ الْآخَرُ ابْنَتَهُ لَيْسَ بَيْنَهُمَا صَدَاقٌ (۸۱)

''رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ''شغار'' سے' اور شغار اِس کو کہتے ہیں کہ نکاح کر دے کوئی شخص اپنی لڑکی کا دوسرے سے اِس شرط پر کہ وہ نکاح کر دے اپنی لڑکی کا اِس کے ساتھ جبکہ دونوں لڑکیوں کا مہر کچھ بھی مقرر نہ کیا جائے''۔

((اَیُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَاَۃً عَلٰی مَا قَلَّ مِنَ الْمَھْرِ اَوْ کَثُرَ لَیْسَ فِیْ نَفْسِہٖ اَنْ یُّؤَدِّیَ اِلَیْھَا حَقَّھَا ، خَدَعَھَا فَمَاتَ وَلَمْ یُؤَدِّ اِلَیْھَا حَقَّھَا لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَھُوَ زَانٍ))(۸۲)

''جس شخص نے کسی عورت سے کم یا زیادہ مہر پر نکاح کیا اور اُس کے دل میں عورت کو اِس مہر کی ادائیگی کا ارادہ ہی نہیں ہے (جو اس کا حق ہے)' اُس نے اُس عورت کو دھوکا دیا اور پھر وہ اسی حالت میں فوت ہو گیا کہ اُس نے اُس عورت کو اُس کا حق نہیں دیا تو قیامت میں اللہ کے حضور ایسے آئے گا کہ وہ زنا کار ہوگا''۔

اگر کسی شخص کو وفات کی وجہ سے اپنی بیوی کا مہر مقرر کرنے کی مہلت نہ مل سکے تو اِس صورت میں بیوہ کو مہرِ مثل (یعنی وہ مہر جو اُس کی قریب ترین عزیزہ کا ہو) دیا جائے گا۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَاَۃً وَلَمْ یَفْرِضْ لَھَا صَدَاقًا' وَلَمْ یَدْخُلْ بِھَا حَتّٰی مَاتَ' فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ : لَھَا مِثْلُ صَدَاقِ نِسَائِھَا' لاَ وَکْسَ وَلاَ شَطَطَ' وَعَلَیْھَا الْعِدَّۃُ وَلَھَا الْمِیْرَاثُ' فَقَامَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانِ الْاَشْجَعِیُّ فَقَالَ: قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِیْ بِرْوَعَ بِنْتِ وَاشِقٍ امْرَاَۃٍ مِّنَّا مِثْلَ الَّذِیْ قَضَیْتَ' فَفَرِحَ بِھَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ (۸۳)

''حضرت ابنِ مسعودؓ سے اُس شخص کے متعلق پوچھا گیا جو نکاح کرنے کے بعد مہر مقرر کرنے اور صحبت کرنے سے پہلے فوت ہو جائے۔ ابنِ مسعودؓ نے فرمایا: ایسی عورت کا مہر اُس کی مثل خواتین کے برابر ہوگا' نہ اُس میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی زیادتی۔ وہ عورت عدت گزارے گی اور اُسے خاوند کے مال سے وراثت ملے گی۔ اِس پر معقل بن سنان اشجعیؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بروع بنت واشقؓ' ہم میں سے ایک خاتون' کے متعلق ایسا ہی فیصلہ دیا جیسا کہ آپؐ نے دیا۔ اِس پر حضرت ابن مسعودؓ بہت خوش ہوئے''۔

مہر کی مقدار کے حوالے سے بھی شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اپنی مالی حیثیت کے اعتبار سے شوہر جتنا چاہے مہر طے کر سکتا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مُصْعَبٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ: لَا تَزِیْدُوْا فِیْ مُھُوْرِ النِّسَاءِ عَلٰی اَرْبَعِیْنَ اَوْقِیَۃً' فَمَنْ زَادَ اَلْقَیْتُ الزِّیَادَۃَ فِیْ بَیْتِ الْمَالِ' فَقَالَتِ امْرَاَۃٌ : مَا ذَاکَ لَکَ؟ قَالَ وَلِمَ؟ قَالَتْ: لِاَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ: ﴿وَاِنْ اٰتَیْتُمْ اِسْتِبْدَالَ

زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا﴾ فَقَالَ عُمَرُ : امْرَاَةٌ اَصَابَتْ وَرَجُلٌ اَخْطَاَ(۸۴)

''حضرت عبداللہ بن مصعب ؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ نے (اپنے دورِ خلافت میں ایک خطبہ کے دوران) حکم دیا کہ'' خواتین کو چالیس اوقیہ سے زیادہ مہر مت دو۔جس نے زیادہ مہر دیا تو میں اضافی مال کو بیت المال میں داخل کردوں گا''۔اِس پر ایک خاتون نے پوچھا آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا'' کیوں؟'' اُس نے کہا اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ'' اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر ہی لو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اُس میں سے کچھ واپس نہ لینا''۔(النساء:۲۰)اِس پر حضرت عمر ؓ نے فرمایا:'' ایک عورت نے صحیح رائے دی اور مرد نے خطا کی''۔

خاندان کی حفاظت

نبی اکرم ﷺ نے آگاہ فرمایا کہ خاندان کو اجاڑنا ابلیس کا سب سے پسندیدہ فعل ہے:

((اِنَّ اِبْلِيْسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً، يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، فَيَقُوْلُ مَا صَنَعْتَ شَيْئًا ، قَالَ ثُمَّ يَجِيْءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ مَاتَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ، قَالَ فَيُدْنِيْهِ مِنْهُ وَيَقُوْلُ نِعْمَ أَنْتَ!)) (۸۵)

''بے شک ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے' پھر اپنے لشکر روانہ کرتا ہے۔اُن میں سے منزلت ومرتبہ کے اعتبار سے ابلیس سے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جس نے سب سے بڑا فتنہ برپا کیا ہوتا ہے۔اُن میں سے ہر ایک آکر اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیے' ابلیس (رپورٹ سن کر) تبصرہ کرتا ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا۔پھر اُن میں سے ایک اور آتا ہے اور اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے جب تک میاں بیوی میں جدائی نہیں ڈال دی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔اِسے ابلیس اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے تو خوب کام کر کے آیا ہے!''

نبی اکرم ﷺ نے خاندان کے استحکام پر بہت زور دیا اور ہر ایسے عمل کی ممانعت فرمائی جس سے میاں بیوی کے درمیان محبت کا رشتہ کمزور ہو:

((لَا تُبَاشِرُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ فَتَنْعَتَهَا لِزَوْجِهَا كَأَنَّهُ يَنْظُرُ اِلَيْهَا))(۸۶)

''کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ ہم مجلس ہونے کے بعد اپنے شوہر کے سامنے اُس عورت کا پورا حال (ناک نقشہ اور حسن و جمال وغیرہ) اِس طرح بیان نہ کرے گویا وہ اُسے دیکھ رہا ہے''۔

اس حدیث مبارکہ میں بیان کردہ نصیحت کی حکمت یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی توجہ کسی اور خاتون کی طرف ہوگئی تو وہ لازماً اپنی بیوی کی طرف سے اعراض کرنے لگے گا۔

نبی اکرم ﷺ نے تلقین فرمائی کہ کوئی خاتون کسی عورت کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ اس کے شوہر کے ساتھ خود نکاح کر سکے۔ فرمایا:

((لاَ تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلاَقَ أُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَاِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا))(۸۷)

''کوئی عورت اپنی بہن کو طلاق دینے کا سوال نہ کرے تاکہ اُس کے پیالہ کو خالی کر دے اور چاہیے کہ وہ اپنا نکاح (کسی دوسرے مسلمان مرد سے) کرلے کیونکہ جو اُس کی تقدیر میں ہے وہ ضرور اُس کو ملے گا''۔

طلاق کے ذریعہ خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَبْغَضُ الْحَلاَلِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالَى الطَّلاَقُ))(۸۸)

''حلال اور جائز چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے''۔

((مَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنَ الْعِتَاقِ، وَلاَ خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَبْغَضُ اِلَيْهِ مِنَ الطَّلاَقِ))(۸۹)

''اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی ایسا عمل جاری نہیں کیا جو غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کرنے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پسندیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی ایسا عمل نہیں رکھا جو اللہ تعالیٰ کو طلاق دینے سے زیادہ ناپسند ہو''۔

دورِ جاہلیت میں طلاقوں کی تعداد یا طلاق دینے کے حوالے سے کوئی طریقۂ کار یا ضابطہ نہ تھا۔ شریعتِ اسلامی میں اِس حوالے سے باقاعدہ رہنمائی عطا کی گئی:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّاسُ وَالرَّجُلُ يُطَلِّقُ امْرَأَتَهُ مَا شَاءَ أَنْ يُطَلِّقَهَا وَهِيَ امْرَأَتُهُ اِذَا ارْتَجَعَهَا وَهِيَ فِي الْعِدَّةِ، وَاِنْ طَلَّقَهَا مِائَةَ مَرَّةٍ أَوْ أَكْثَرَ حَتّٰى قَالَ رَجُلٌ لِامْرَأَتِهِ وَاللّٰهِ لاَ أُطَلِّقُكِ فَتَبِيْنِيْ مِنِّيْ، وَلاَ آوِيْكِ أَبَدًا

قَالَتْ وَكَيْفَ ذَاكَ؟ قَالَ أُطَلِّقُكِ، فَكُلَّمَا هَمَّتْ عِدَّتُكِ أَنْ تَنْقَضِيَ رَاجَعْتُكِ، فَذَهَبَتِ الْمَرأَةُ حَتّٰى دَخَلَتْ عَلٰى عَائِشَةَ فَأَخْبَرَتْهَا، فَسَكَتَتْ عَائِشَةُ حَتّٰى جَاءَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَخْبَرَتْهُ فَسَكَتَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى نَزَلَ الْقُرْآنُ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ قَالَتْ عَائِشَةُ فَاسْتَأْنَفَ النَّاسُ الطَّلَاقَ مُسْتَقْبَلاً مَنْ كَانَ طَلَّقَ وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ طَلَّقَ (۹۰)

''حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں کوئی شخص اپنی بیوی کو جتنی چاہتا طلاقیں دے دیتا اور پھر عدت کے دوران رجوع کر لیتا تو وہ اُس کی بیوی رہتی اگرچہ اُس نے سو یا اِس سے زیادہ طلاقیں ہی کیوں نہ دی ہوتیں۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تمہیں کبھی طلاق نہ دوں گا تاکہ تو مجھ سے جدا نہ ہو جائے لیکن اِس کے باوجود تجھ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ اُس نے پوچھا وہ کیسے؟ اُس نے کہا وہ اِس طرح کہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور پھر جب تمہاری عدت پوری ہونے والی ہوگی تو رجوع کر لوں گا۔ (اِسی طرح پھر طلاق دوں گا اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لوں گا اور ہمیشہ اِسی طرح کرتا رہوں گا)۔ وہ عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی اور اُنہیں بتایا تو وہ خاموش رہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اُنہیں یہ قصہ سنایا، لیکن آپ ﷺ بھی خاموش رہے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ ''طلاق دو ہی مرتبہ ہے، اس کے بعد یا تو قاعدے اور دستور کے مطابق رکھ لینا ہے یا احسن طریقے سے چھوڑ دینا ہے''۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ اِس کے بعد لوگوں نے طلاق کا حساب رکھنا شروع کر دیا، جو دے چکے تھے اُنہوں نے بھی اور جنہوں نے نہیں دی تھی اُنہوں نے بھی''۔

جو کوئی طلاق کے حوالے سے شریعت کے طے کردہ ضابطہ سے انحراف کرتا تو اس سے رسول اللہ ﷺ سخت ناراض ہوتے۔ حدیث نبویؐ ہے:

أُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعًا فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ: ((أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَأَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ؟)) (۹۱)

رسول اللہ ﷺ کو ایک شخص کے متعلق اطلاع ملی کہ اُس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہیں، تو آپ ﷺ سخت غصہ کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا:

''کیا اللہ کی کتاب سے کھیلا جائے گا جبکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟''

بیوہ کے حقوق

نبی اکرم ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ ہیں:

((اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ —— وَأَحْسِبُهُ قَالَ : وَکَالْقَائِمِ لاَ یَفْتُرُ وَکَالصَّائِمِ لاَ یُفْطِرُ)) (۹۲)

''کسی بے چاری بے شوہر والی عورت یا کسی مسکین حاجت مند کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ (اللہ کے نزدیک اور اجر وثواب میں) راہِ خدا میں جہاد کرنے والے بندے کے مثل ہے —— اور میرا گمان ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا تھا: اُس قائم اللیل (یعنی شب بیدار) بندے کی طرح ہے جو (عبادت اور شب خیزی میں) سستی نہ کرتا ہو اور اُس صائم الدہر بندے کی طرح ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو، کبھی ناغہ نہ کرتا ہو''۔

عَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِکٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ : ((أَلاَ أَدُلُّکُمْ عَلٰی أَفْضَلِ الصَّدَقَةِ؟ اِبْنَتُکَ مَرْدُوْدَةً اِلَیْکَ لَیْسَ لَهَا کَاسِبٌ غَیْرُکَ)) (۹۳)

حضرت سُراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں افضل ترین صدقہ نہ بتادوں؟ (پھر خود ہی جواب دیا کہ) افضل ترین صدقہ یہ ہے کہ تم اپنی اُس لڑکی پر خرچ کرو جو طلاق کی وجہ سے یا بیوہ ہو کر تمہارے پاس (شوہر کے گھر سے) واپس آ گئی اور تمہارے علاوہ کوئی اُس کے لیے کمائی کرنے والا نہیں ہے''۔

کنیز کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب

کنیز کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب رسول اللہ ﷺ نے اِس طرح دی:

((ثَلاَ ثَةٌ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَیْنِ : اَلرَّجُلُ تَکُوْنُ لَهُ اَلْاَ مَةُ فَیُعَلِّمُهَا فَیُحْسِنُ تَعْلِیْمَهَا وَیُؤَدِّبُهَا فَیُحْسِنُ أَدَبَهَا ثُمَّ یُعْتِقُهَا فَیَتَزَوَّجُهَا فَلَهُ اَجْرَانِ، وَمُؤْمِنُ اَهْلِ الْکِتَابِ الَّذِیْ کَانَ مُؤْمِنًا ثُمَّ اٰمَنَ بِالنَّبِیِّ ﷺ فَلَهُ اَجْرَانِ ، وَالْعَبْدُ الَّذِیْ یُؤَدِّیْ حَقَّ اللّٰهِ وَیَنْصَحُ لِسَیِّدِهٖ)) (۹۴)

''تین اشخاص کو اُن کی نیکیوں کا اجر دگنا ملے گا: پہلا وہ شخص جس کی ملکیت میں کنیز ہو، وہ اُسے تعلیم دے اور عمدہ تعلیم دے، اُسے ادب سکھائے اور عمدہ ادب سکھائے، پھر اُسے آزاد کر کے اُسی کے ساتھ نکاح کر لے تو اُس کے لیے دگنا اجر ہے۔ دوسرا اہلِ کتاب

میں سے مؤمن شخص جو پہلے بھی مؤمن تھا اور پھر ایمان لایا نبی اکرم ﷺ پر تو اُس کے لیے دگنا اجر ہے۔ اور تیسرا وہ غلام جو اللہ کا بھی حق ادا کرے اور اپنے آقا کا بھی''۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فِي الَّذِيْ يُعْتِقُ جَارِيَتَهُ ثُمَّ يَتَزَوَّجُهَا لَهُ اَجْرَانِ))(۹۵)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی نے آزاد کیا اپنی کنیز کو پھر اُس سے نکاح کر لیا' اُس کے لیے دو اجر ہیں (یعنی ایک تو کنیز آزاد کرنے کا اور دوسرا اُس سے نکاح کر لینے کا)''۔

حرف آخر

موجودہ دَور میں بہیمیت کا ایک سیلاب آ رہا ہے۔ نام نہاد روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے پردے میں خواتین کے تقدس کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اُنہیں میراتھن ریس کے دوران سڑکوں پر دوڑنے کی ترغیب دی جا رہی ہے' میڈیا اور دیگر تشہیری ذرائع سے بے حیائی کے نت نئے انداز سکھائے جا رہے ہیں' مخلوط محافل میں مَردوں کے ساتھ ناچنے کے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں' گھروں سے بھاگ کر پسند کی شادیاں کرنے والیوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور اسمبلیوں میں ۳۳ فیصد نشستیں مخصوص کر کے خواتین کو گھروں کی چار دیواری سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ اِن مذموم حرکات کی مخالفت کرنے والوں کو انتہا پسند اور ترقی کا دشمن قرار دیا جا رہا ہے۔ ایسے میں ہر مسلمان بھائی اور بہن کا فرض ہے کہ اِس بات کو پورے زور وشور سے واضح کرے کہ دنیا میں عادلانہ حقوق اور آخرت میں فوز وفلاح کا حصول صرف اور صرف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات کی تعمیل میں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے عمل کی توفیق عطا فرمائے جسے وہ پسند فرماتا ہے اور جس سے وہ راضی ہو جاتا ہے۔ آمین!

حواشی

٤٦) لسان الميزان للعقيلي ٢١٧/٨۔ سلسلة الاحاديث الضعيفة للالبانی' ح ٥٩٣ عن عبد الله بن عباس۔

٤٧) سنن النسائی' كتاب الجهاد' باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة۔

٤٨) صحيح البخاری' كتاب الادب' باب من احق الناس بحسن الصحبة۔

٤٩) الصحيح المسند للوداعی' ح ١٥٥٥۔

٥٠) مستدرك الحاكم۔ارواء الغليل للالبانی' ح ٢١٧١۔

٥١) صحيح البخاری' كتاب الادب' باب صلة المرأة امها ولها زوج۔وصحيح مسلم'

كتاب الزكاة، باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين والزوج والاولاد۔

٥٢) صحيح البخارى، كتاب الادب، باب عقوق الوالدين من الكبائر۔ وصحيح مسلم، كتاب الاقضية، باب النهى عن كثرة المسائل من غير حاجة والنهى عن منع وهات.....

٥٣) سنن الترمذى، كتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى بر الخالة۔

٥٤) سنن الترمذى، كتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى بر الخالة۔

٥٥) سنن ابن ماجه، كتاب الادب، باب بر الوالد والاحسان الى البنات۔

٥٦) كنز العمال۔

٥٧) مسند احمد۔

٥٨) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الاحسان الى البنات۔

٥٩) سنن الترمذى، كتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى النفقة على البنات والاخوات۔

٦٠) صحيح البخارى، كتاب الزكاة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة والقليل من الصدقة۔وصحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الاحسان الى البنات۔

٦١) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الاحسان الى البنات۔

٦٢) مسند احمد۔

٦٣) الطبرانى۔سلسلة الاحاديث الضعيفة للالبانى، ح ٣٤٠۔

٦٤) سنن ابى داؤد، كتاب الادب، باب فى فضل من عال يتيما۔

٦٥) سنن الترمذى، كتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى النفقة على البنات والاخوات۔

٦٦) مسند احمد۔

٦٧) كنز العمال۔

٦٨) صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب خير متاع الدنيا المرأة الصالحة۔

٦٩) سنن الترمذى، كتاب المناقب عن رسول اللهﷺ، باب فضل ازواج النبىﷺ۔

٧٠) سنن الترمذى، كتاب الرضاع، باب ما جاء فى حق المرأة على زوجها۔

٧١) صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء۔

٧٢) سنن ابى داؤد، كتاب النكاح، باب فى حق المرأة على زوجها۔

٧٣) صحيح البخارى، كتاب الايمان، باب ما جاء ان الاعمال بالنية والحسبة ولكل امرئ ما نوى۔

٧٤) صحيح البخارى، كتاب احاديث الانبياء، باب خلق آدم وذريته۔وصحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء۔
٧٥) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبى ﷺ۔
٧٦) سنن الترمذى، كتاب الرضاع، باب ما جاء فى حق المرأة على زوجها۔
٧٧) صحيح البخارى، كتاب تفسير القرآن، باب وقال مجاهد بطغواها بمعاصيها ولا يخاف عقباها۔
٧٨) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ضرب النساء۔
٧٩) سنن الترمذى، كتاب النكاح عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى التسوية بين الضرائر۔
٨٠) سنن الترمذى، كتاب النكاح عن رسول اللهﷺ، با ب ما جاء فى التسوية بين الضرائر۔
٨١) صحيح البخارى، كتاب النكاح، باب الشغار۔ وصحيح مسلم، كتاب النكاح، باب تحريم نكاح الشغار وبطلانه۔
٨٢) الطبرانى۔
٨٣) سنن الترمذى، كتاب النكاح عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى الرجل يتزوج المرأة فيموت عنها قبل ان يفرض لها۔
٨٤) كنز العمال۔
٨٥) صحيح مسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس وان مع كل انسان قرينا۔
٨٦) صحيح البخارى، كتاب النكاح، باب لا تباشر المرأة المرأة فتنعتها لزوجها۔
٨٧) صحيح البخارى، كتاب القدر، باب وكان امر الله قدرا مقدورا۔وصحيح مسلم، كتاب النكاح، باب تحريم الجمع بين المرأة وعمتها او خالتها فى النكاح۔
٨٨) سنن ابى داوٗد، كتاب الطلاق، باب فى كراهة الطلاق۔
٨٩) سنن دارقطنى۔
٩٠) سنن الترمذى، كتاب الطلاق واللعان عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فى طلاق المعتوه۔
٩١) سنن النسائى، كتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعة ومافيه من التغليظ۔
٩٢) صحيح البخارى، كتاب الادب، باب الساعى على المسكين۔ وصحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب الاحسان الى الارملة والمسكين واليتيم۔
٩٣) سنن ابن ماجه، كتاب الادب، باب بر الوالد والاحسان الى البنات۔
٩٤) صحيح البخارى، كتاب الجهاد والسير، باب فضل من اسلم من اهل الكتابين۔
٩٥) صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب فضيلة اعتاقه امته ثم يتزوجها۔

عفو و درگزر کی اہمیت

احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ ساری موجودات کا خالق ہے ۔ چرند پرند' کیڑے مکوڑے' تمام قسم کے حیوانات اور انسان اس کی مخلوق ہیں۔ وہ اپنی ہر قسم کی مخلوق کی ضروریات پوری کر رہا ہے' اُسے اپنی مخلوق کے ساتھ محبت ہے۔ جو انسان اللہ کی مخلوق کے کسی فرد کے ساتھ نرم رویہ اور ہمدردی اختیار کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بڑا اچھا لگتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ))(۱)

''ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں وہ آدمی زیادہ محبوب ہے جو اللہ کی عیال کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے''۔

قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ جو شخص دوسروں کے ساتھ بھلائی کا رویہ رکھے' اُن سے ہمدردی کرے' ان کو تکلیف نہ پہنچائے' بلکہ مصیبت اور پریشانی میں مبتلا افراد کی پریشانی دُور کرنے کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتا ہے۔ بلکہ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان کسی بھی ذی روح کے لیے اذیت کا باعث نہ بنے۔ انسان تو انسان رہے' کسی جانور کو بھی بھوکا پیاسا رکھنا اللہ کے عذاب کا باعث ہے۔ موذی جانوروں مثلاً سانپ' بچھو وغیرہ کا معاملہ اور ہے' ان کو مار دینے کی اجازت ہے' مگر انہیں بھی بھوکا پیاسا رکھ کر مارنا جائز نہیں۔ کسی بے زبان مخلوق پر ہمدردی کرنے والوں کا اللہ کے ہاں بہت عمدہ مقام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((غُفِرَ لامْرَأَةٍ مُوْمِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰى رَأْسِ رَكِيٍّ يَلْهَثُ قَالَ كَادَ

يَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَأَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهُ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِکَ))(۲)

''ایک بدچلن عورت کی اس عمل پر بخشش ہوگئی کہ وہ ایک کتے کے پاس سے گزری جو ایک کنویں کے پاس اس حالت میں تھا کہ (پیاس کی شدت کی وجہ سے) اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ ہانپ رہا تھا' قریب تھا کہ وہ پیاس سے مر جائے۔ اس عورت نے پاؤں سے اپنا چمڑے کا موزہ اُتارا' پھر اسے اپنی اوڑھنی میں باندھا اور اس کتے کے لیے (کنویں سے) پانی نکالا تو اسی پر اُس کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا گیا''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ اَجْرًا؟ قَالَ: ((فِيْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ))(۳)

''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہمارے لیے جانوروں (کے کھلانے پلانے) میں بھی ثواب ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک ہر تر جگر رکھنے والی (یعنی زندہ مخلوق کے ساتھ حسن سلوک) میں ثواب ہے''۔

پیاسے کتے کو پانی پلانا اس بدچلن عورت کے لیے بخشش کا سبب بن گیا۔ اُس نے کسی غرض کے بغیر محض ایک جاندار کی جان بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ اُس نے اللہ کی مخلوق پر رحم کھایا تو اللہ نے اس پر رحم کھایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ))(۴)

''(اللہ کی مخلوق پر) رحم کھانے والوں اور ترحم کا معاملہ کرنے والوں پر خداوند رحمٰن کی خاص رحمت ہوگی۔ تم زمین والی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرو' آسمان والا تم پر رحمت فرمائے گا''۔

یوں مخلوق پر رحم کھانا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا محبوب اور مقبول عمل ہے۔ خوش بخت ہے وہ بندہ جو محض اللہ کی رضا کی خاطر' بغیر کسی ادنیٰ سی ذاتی منفعت کے' کسی انسان یا حیوان پر رحم کھاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِيْقٍ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَاُنَحِّيَنَّ هٰذَا عَنِ

الْمُسْلِمِيْنَ لَا يُؤْذِيْهِمْ ، فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ))(۵)

''اللہ کا کوئی بندہ کسی راستے پر چلا جا رہا تھا کہ اُس راستے پر کسی درخت کی ایک شاخ تھی (جو گزرنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث تھی)۔ اس بندے نے کہا اللہ کی قسم! میں اِس شاخ کو لازماً مسلمانوں کے راستے سے ہٹا کر راستہ صاف کر دوں گا' تاکہ بندگانِ خدا کو تکلیف نہ ہو۔ پھر (اس نے ایسا ہی کیا تو اپنے اس عمل کی وجہ سے) وہ جنت میں بھیج دیا گیا''۔

مخلوقِ خدا کی خدمت اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ عمل ہے۔ اس کے بندوں کو آرام پہنچانا یا ان سے کوئی تکلیف دور کرنا بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ نَّفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ، وَمَنْ يَّسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، وَاللّٰهُ فِىْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِىْ عَوْنِ اَخِيْهِ))(۶)

''جس نے کسی مؤمن سے دنیا کے دکھوں میں سے کوئی دکھ دُور کیا اللہ تعالیٰ اُس سے قیامت کے دکھوں میں سے ایک دکھ دُور کر دے گا' اور جس نے کسی تنگ حال شخص پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا' اور جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اُس وقت تک بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے''۔

خالق کائنات ایسے بندوں پر خوش ہوتا ہے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی' خیر خواہی اور درگزر کا معاملہ کرتے ہیں' دوسرے کو سہولت دیتے اور مشقت اور سختی سے بچاتے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهُ فَقِيْلَ لَهُ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ مَا اَعْلَمُ ، قِيْلَ لَهُ انْظُرْ، قَالَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ اَنِّىْ كُنْتُ أُبَايِعُ النَّاسَ فِى الدُّنْيَا وَأُجَازِيْهِمْ فَأُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَ اَتَجَاوَزُ عَنِ

الْمُسْلِمِيْنَ لَا يُؤْذِيْهِمْ ، فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ))(۵)

''اللہ کا کوئی بندہ کسی راستے پر چلا جا رہا تھا کہ اُس راستے پر کسی درخت کی ایک شاخ تھی (جو گزرنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث تھی)۔ اس بندے نے کہا اللہ کی قسم! میں اِس شاخ کو لازماً مسلمانوں کے راستے سے ہٹا کر راستہ صاف کر دوں گا' تاکہ بندگانِ خدا کو تکلیف نہ ہو۔ پھر (اس نے ایسا ہی کیا تو اپنے اس عمل کی وجہ سے) وہ جنت میں بھیج دیا گیا''۔

مخلوقِ خدا کی خدمت اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ عمل ہے۔ اس کے بندوں کو آرام پہنچانا یا ان سے کوئی تکلیف دور کرنا بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ نَّفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ، وَمَنْ يَّسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، وَاللّٰهُ فِىْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِىْ عَوْنِ اَخِيْهِ))(۶)

''جس نے کسی مؤمن سے دنیا کے دکھوں میں سے کوئی دکھ دُور کیا اللہ تعالیٰ اُس سے قیامت کے دکھوں میں سے ایک دکھ دُور کر دے گا' اور جس نے کسی تنگ حال شخص پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا' اور جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اُس وقت تک بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے''۔

خالق کائنات ایسے بندوں پر خوش ہوتا ہے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی' خیر خواہی اور درگزر کا معاملہ کرتے ہیں' دوسرے کو سہولت دیتے اور مشقت اور سختی سے بچاتے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ أَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهُ فَقِيْلَ لَهُ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ مَا اَعْلَمُ ، قِيْلَ لَهُ انْظُرْ، قَالَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ اَنِّىْ كُنْتُ أُبَايِعُ النَّاسَ فِى الدُّنْيَا وَأُجَازِيْهِمْ فَأُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَ اَتَجَاوَزُ عَنِ

الْمُعْسِرِ ، فَأَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ)) (۷)

''تم سے پہلی اُمت میں ایک ایسا آدمی تھا کہ جب موت کا فرشتہ اُس کی روح قبض کرنے آیا (اور قبضِ روح کے بعد وہ اِس دنیا سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو گیا) تو اس سے پوچھا گیا کیا تو نے (دنیا میں) کوئی نیک عمل کیا تھا (جو تیرے لیے وسیلۂ نجات بن سکے)؟ اس نے عرض کیا: میرے علم میں (میرا کوئی ایسا عمل) نہیں ہے۔ اس سے کہا گیا (اپنی زندگی پر) نظر ڈال (اور غور کر)۔ اس نے پھر عرض کیا: میرے علم میں اور کوئی چیز نہیں سوائے اس کے کہ میں دنیا میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور خرید و فروخت کا معاملہ کیا کرتا تھا تو میرا رویہ اُن کے ساتھ درگزر اور نرمی کا ہوتا تھا۔ میں دولت مندوں کو بھی (قرض وغیرہ میں) مہلت دے دیتا تھا اور تنگ دستوں کو معاف بھی کر دیتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل فرما دیا''۔

پہلی اُمت کے کسی نرم دل، نرم خو اور سہولت دینے والے شخص کا واقعہ سنا کر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اُمتیوں کو یہ تعلیم دی کہ لوگوں کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرنا اتنا اچھا عمل ہے کہ انسان کی نجات کا باعث بن کر اُسے جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ نرمی اور درگزر کے رویے کی فضیلت کا ذکر آپؐ نے بار بار کیا ہے تاکہ اس رویے کو اپنا کر اُمت کے افراد اِس کے ثمر شیریں سے لذت اندوز ہو سکیں۔

معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے بعض افراد کسی عہدے پر فائز ہوتے ہیں، انہیں لوگوں کی شکایات سننا اور اُن کا ازالہ کرنا ہوتا ہے۔ ایسے حاکموں کو رسول اللہ ﷺ نے نرمی اور رحم دلی کا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ، وَأَبْغَضَ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ وَأَبْعَدَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ جَائِرٌ)) (۸)

''یقیناً قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب اور مجلس کے اعتبار سے مقرب ترین عادل و منصف سربراہِ حکومت ہو گا اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسند اور مجلس کے اعتبار سے بعید ترین ظالم حکمران ہو گا''۔

یعنی جہاں نرم مزاج اہلکاروں کی فضیلت بیان ہوئی ہے وہاں سخت گیر اور تند خو حکمرانوں کو سزا کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ

فرماتے سنا ہے :

((مَا مِنْ عَبْدٍ اسْتَرْعَاهُ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ اِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ)) (۹)

''جس بندے کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا حاکم ونگران بنائے اور وہ لوگوں کی پوری پوری خیر خواہی نہ کرے تو ایسا حاکم جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا''۔

ایک مسلمان کا عام رویہ نرمی اور خیر خواہی کا ہونا چاہیے' دوسروں کی بھلائی اس کا مشن ہو اور دوسروں کی پریشانی اسے بے چین کرتی ہو۔ وہ ہر وقت اِس تاک میں رہے کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت اس سے پوری ہو سکے یا کسی کے نقصان کا وہ ازالہ کر سکے' لیکن جہاں انصاف اور قانون کا معاملہ ہوگا وہاں کسی قسم کی رعایت نہ ہوگی۔ اگر حاکم یا منصف کے سامنے کسی کا جرم ثابت ہو جائے جس کی اسلامی قانون کے مطابق سزا مقرر ہے تو وہاں مجرم کو سزا سے بچانے کی کوشش کرنا اور قانونی تقاضوں کے پورا کرنے سے گریز کرنا ہرگز جائز نہیں۔

حواشی

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

(۲) صحیح البخاری'کتاب بدء الخلق' باب اذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسہ فان فی احدیٰ جناحیہ داءً وفی الأخریٰ شفاء۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب المساقاۃ' باب فضل سقی الماء۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب فی فضل السقی البھائم المحترمۃ واطعامھا۔

(٤) سنن الترمذی' کتاب البر والصلۃ عن رسول اللہﷺ' باب ما جاء فی رحمۃ الناس۔

(٥) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق۔

(٦) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر۔

(۷) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسراء یل۔

(۸) سنن الترمذی' کتاب الاحکام عن رسول اللہﷺ'باب ما جاء فی الامام العادل۔

(۹) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح......

قانون کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور اسلام

حافظ طاہر اسلام عسکری

بنی نوعِ انسان میں فطری وطبعی طور پر باہم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے، سبقت لے جانے اور مقابلہ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جب دو افراد ایک ہی شے کے حصول کی خاطر سعی و جہد کرتے ہیں تو ان کے مابین لازماً تصادم اور تنازع پیدا ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ سے جنم لینے والے فتنہ وفساد کے خاتمے کے لیے فاطرِ فطرت نے ہر انسان کے حقوق وفرائض متعین فرما دیے ہیں تاکہ ان کی پابندی کر کے معاشرتی امن وسکون برقرار رکھا جا سکے، لیکن انسانی مزاج کی کمزوری ہے کہ وہ ضوابط وقواعد کی پابندی پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ مطلق آزادی کو پسند کرتا ہے۔ جب تک انسان اپنے فرائض کی ادائیگی نہ کرے، دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھے اور مقررہ حدود کی پابندی نہ کرے، امن کا قیام ناممکن ہے۔ کائنات سے ظلم وجور کو مٹا کر امن وانصاف قائم کرنے کے لیے تمام لوگوں کو خالقِ کائنات کے طے کردہ حدود وقوانین پر کاربند رکھنے کو نظامِ عدل کا نام دیا جاتا ہے۔

معاشرتی استحکام کے لیے نظامِ عدل وانصاف کا مستحکم ہونا ایسا ناگزیر امر ہے جس میں کسی فردِ بشر کو اختلاف نہیں۔ قوموں کے عروج وزوال کے باب میں سنتِ الٰہی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن اقوام وملل کو دنیا میں منصب قیادت پر فائز فرمایا ہے ان میں دو اوصاف لازمی طور پر نظر آتے ہیں: ایک یہ کہ وہ قوم علم وبصیرت میں اپنے زمانے کی دیگر قوموں سے ممتاز ومنفرد ہوتی ہے اور دوسرے اس نے عدل وانصاف کو اپنا شعار بنا رکھا ہوتا ہے۔ اسلامی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب تک مسلمان ان دو خوبیوں کے حامل ہے، وہی بارگاہِ خداوندی میں عزت ورفعت اور سطوت واقتدار کے مستحق گردانے گئے لیکن

جب انہوں نے ان پہلوؤں سے کمزوری دکھائی اور علم ومعرفت کے بجائے جہالت وجمود کو اپنا لیا اور عدل وانصاف کے بجائے ظلم وستم کے مرتکب ہوئے تو ذلت ورسوائی ان کا مقدر ٹھہری۔ دنیا میں امامت وپیشوائی کا مقام پانے کے یہ دو اصول ایسے حتمی اور قطعی ہیں کہ اگر کافر قوموں نے بھی ان کی پاسداری کی تو انہیں بھی دنیوی غلبہ وتسلط عطا کر دیا گیا۔

دینِ اسلام میں عدل وانصاف کو جس انداز سے اجاگر کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت پر جس طرح زور دیا گیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی بنیاد ہی عدل پر ہے، بلکہ قرآن کریم تو پوری صراحت سے رسولوں کی رسالت کا مقصد ہی یہ بتاتا ہے کہ ان کی تعلیمات سے لوگ عدل وانصاف پر قائم رہنے کا سبق سیکھیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: ۲۵)

''تحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔''

قرآن مجید کی دسیوں آیات میں عدل وانصاف کو قائم کرنے اور اس پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح سینکڑوں احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ وتابعینؒ عدل کی اہمیت کے حوالے سے کتب احادیث میں موجود ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ''سیاستِ شرعیہ'' میں عدل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سیاستِ شرعیہ کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک ہے مناصب اور عہدے اہل تر لوگوں کے سپرد کرنا اور دوسرا ہے فیصلے کرتے ہوئے عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنا''۔(۱)

اہمیتِ عدل کے حوالے سے شیخ الاسلام ہی کے تلمیذِ رشید اور ان کے علوم ومعارف کے حقیقی وارث وترجمان علامہ ابن القیم الجوزیہؒ لکھتے ہیں:

ان مقصوده اقامة العدل بين عباده وقيام الناس بالقسط(۲)

''اللہ کے دین کا مقصد یہی ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان انصاف قائم کیا جائے اور لوگ انصاف پر قائم رہیں''۔

قرآن وسنت میں عدل وانصاف کے حوالے سے دیے گئے تاکیدی احکامات کے پیشِ نظر علمائے اسلام کے نزدیک عدل کے قیام کی خاطر نظامِ قضا قائم کرنا فرض ہے اور اس امر پر امت کا اجماع ہے۔ مسلمانوں نے اس فرض کی ادائیگی میں انتہائی مستعدی اور ذمہ داری کا

رویہ اپنایا۔ اسی بنا پر ساری دنیا اس حقیقت کی گواہ ہے کہ تاریخِ اسلامی میں جس چیز نے سب سے زیادہ شہرت پائی اور ملت اسلامیہ کے حسن کو آشکار کیا' وہ اسلام کا عدالتی نظام ہے۔ مسلم قاضیوں اور ججوں نے عدل و انصاف کی ایسی روشن مثالیں پیش کیں کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ خلفائے راشدین کا زریں عہد تو اس حوالے سے خصوصی شہرت کا حامل ہے ہی' لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد کے زمانوں میں بھی عدل گستری کی روشن قندیلیں کم تعداد میں نظر نہیں آتیں۔ اسلامی عدالتوں کے منصفوں نے امیر و غریب' قوی و ضعیف اور شاہ و گدا کے فرق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے لاگ اور جرأت مندانہ عدالتی احکام جاری کر کے اُمتِ مسلمہ کے اندر اسلامی عدلیہ کا وقار و اعتماد قائم کیا اور عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔

ماہرینِ امورِ عدلیہ اس نکتے پر متفق ہیں کہ عدالتی نظام معاشرے میں اسی صورت میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے جب اس میں دو خصوصیات پائی جائیں:

اوّلاً جو قانون اس نظام کی بنیاد ہو اسے معتدل و متوازن ہونا چاہیے' نیز اس میں ہمہ گیریت اور نمو پذیری کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ اس پہلو سے اسلام کے قانون کو دیکھا جائے تو وہ ہر لحاظ سے کامل نظر آتا ہے۔ قانونِ اسلامی کے اصول و قواعد تو سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کے تشکیل کردہ ہیں' رہیں جزئیات و فروعات تو وہ بھی کسی حد تک اللہ ہی کی وضع کردہ ہیں۔ اسلامی قانون اس درجہ اعلیٰ و ارفع ہے کہ دیگر انسانی قوانین اس کے سامنے بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔

ثانیاً عدالتی نظام کی مضبوطی اور تأثیر کے لیے یہ بھی ازبس ضروری ہے کہ عدالت و قضا سے وابستہ قاضیوں اور ججوں کا کردار جرأت' شجاعت' پاکدامنی' امانت و دیانت اور غیر جانبداری کے ان پیمانوں پر پورا اترتا ہو جو بشری استطاعت کے مطابق اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی عدالتی تاریخ میں ہمیں جو اعلیٰ و ارفع نظائر ملتی ہیں اور جس بنیاد پر اسلامی عدلیہ بنی نوع انسان کے لیے باعث راحت و برکت ثابت ہوتی ہے وہ مندرجہ بالا انہی دو اصولوں کی ہی مرہونِ منت ہے۔

تاریخی و شرعی پہلو سے اگرچہ ان دونوں اصولوں کی تفصیل و توضیح وقت کی اہم ضرورت ہے' تاہم کچھ وجوہ کی بنا پر زیرِ نظر تحریر میں دوسرے نکتے یعنی مسلم جج کی شجاعت' آزادی و بے خوفی اور اعتماد کے حوالے سے چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں' اس لیے کہ قانون کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔

ایک قاضی و فیصل کو اپنے فیصلے میں کسی بھی بڑے سے بڑے عہدیدار اور حاکم سے مرعوب ہونے کے بجائے جو پوری آزادی اور مکمل اعتماد ہونا چاہیے اور عدلیہ کی بالادستی کو جس ذمہ داری سے قائم رکھنا چاہیے' اس کا اوّلین درس تو خود محسنِ اعظم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے یوں دیا کہ اپنے آپؐ کو بھی انصاف کی عدالت میں پیش کر دیا کہ جسے بدلہ لینا ہو یا اس کا کوئی حق آپؐ کے ذمہ واجب الادا ہو وہ بلا جھجک لے سکتا ہے۔ اس طرح کی متعدد مثالیں کتبِ احادیث وسیرت میں محفوظ ہیں۔

اس بے مثال اقدام کے بعد آپ ﷺ نے اس کی توسیع میں یہ انقلابی تصور پیش کیا کہ اولادِ آدمؑ میں کسی قسم کی تفریق گوارا نہیں کی جاسکتی اور طاقتور اور کمزور کے لیے یکساں احکام نافذ ہوں گے۔ نبی مکرم ﷺ نے بعثتِ نبویؐ سے قبل کے معاشرتی ظلم وناانصافی اور امتیازات کو ختم کر کے نسلِ انسانی کے حقوق کی مساوات کا اعلان فرمایا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے یہود اور دیگر اقوام نے قوی وضعیف کے لیے الگ الگ قانون وضع کر رکھے تھے' آپ ﷺ نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔

عدالت میں فیصلوں کی آزادی وغیر جانبداری پر جہاں کسی کا خوف یا رعب اثر انداز ہوتا ہے' بسا اوقات کسی کی سفارش بھی عدل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ پیغمبرِ اعظم ﷺ نے چوری کی مرتکب ایک بااثر قبیلے کی خاتون کے بارے میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جیسے محبوب ترین شخص کی سفارش کو سختی سے ردّ کرتے ہوئے وہ الفاظ ارشاد فرمائے جو رہتی دنیا تک عدل وانصاف کا معیار قرار پائے کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو محمدؐ اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

قانون کے سامنے سب کو برابر سمجھنے اور مکمل غیر جانبداری اور آزادی سے فیصلے کرنے کی اس نبوی تعلیم کو خلافتِ راشدہ میں مکمل طور پر بامِ عروج تک پہنچا دیا گیا۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق میں آج بھی یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ کہیں گر گئی اور ایک عیسائی کے ہاتھ لگ گئی۔ جنابِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس دیکھ پہچان لی اور قاضی شُریح کی عدالت میں دعویٰ داخل کر دیا۔ عیسائی نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اور امیر المؤمنین جھوٹے ہیں۔ قاضی شریح نے سیدنا علیؓ سے پوچھا: آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ آپؓ نے فرمایا: نہیں! قاضی نے فیصلہ عیسائی کے حق میں دے دیا۔ اس فیصلے کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور کہا یہ تو انبیاء جیسا انصاف ہے کہ امیر المؤمنین مجھے اپنے مقرر کردہ قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔ بعد میں عیسائی نے اعتراف کیا

کہ زرہ سیدنا علیؓ سے صفین کی طرف جاتے ہوئے گر گئی تھی۔ دامادِ رسول جنابِ علی مرتضیٰ ؓ اس کے ایمان لانے پر بہت خوش ہوئے اور اپنی وہ زرہ اسے عطا کر دی۔ ساتھ ایک گھوڑا بھی بطور امداد دیا۔ بعد میں یہی نومسلم خوارج کے خلاف جنگ میں سیدنا علیؓ کی حمایت میں لڑائی میں بھی شریک ہوا۔(۳)

ایک غیر صحابی قاضی کا خلیفہ راشد صحابیؓ کے خلاف فیصلہ دینا بہر حال ایک غیر معمولی واقعہ اور عدل و انصاف کے اعلیٰ ترین معیار کی زریں مثال ہے۔ اسلامی عدلیہ کی تاریخ تو یہاں تک بتاتی ہے کہ اگر کسی منصف نے حاکم وقت کو عدالت میں اس کے عہدے کا خیال کرتے ہوئے پروٹوکول دینے کی کوشش کی تو وہ جج جیسے عظیم منصب کا اہل نہ سمجھا گیا اور اسے اپنے عہدے سے معزول ہونا پڑا۔ درج ذیل واقعہ ملاحظہ کیجیے:

ایک دفعہ خلیفۂ وقت سیدنا عمر فاروق ؓ اور سیدنا اُبی بن کعب ؓ کے مابین نزاع پیدا ہوئی۔ اُبی بن کعبؓ نے سیدنا زید بن ثابت ؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا اور مدعا علیہ کی حیثیت سے فاروق اعظمؓ عدالت میں حاضر ہوئے۔ سیدنا زید بن ثابتؓ نے سیدنا عمرؓ سے اکرام و تعظیم کا برتاؤ کیا۔ فاروق اعظم نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے۔ یہ کہہ کر اُبیؓ کے برابر بیٹھ گئے۔ سیدنا اُبیؓ کے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت نہ تھا اور جناب فاروق ؓ کو دعوے سے انکار تھا۔ قاعدہ کے مطابق سیدنا عمرؓ پر حلف عائد ہوا۔ قاضی عدالت زیدؓ نے سیدنا اُبیؓ سے درخواست کی کہ امیر المؤمنین کو قسم سے معاف رکھو۔ سیدنا عمرؓ اس طرف داری سے رنجیدہ خاطر ہوئے اور سیدنا زید بن ثابتؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں تم منصب قضاء کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے''۔(۴)

قانونی مساوات اور انصاف کی برتری کا یہ معیار محض خلافتِ راشدہ تک ہی محدود نہیں رہا' بلکہ یہ تسلسل بعد کے ادوار میں بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ بصرہ کے مشہور فقیہہ اور اپنے تقویٰ' نیز فہم و ذکاوت میں معروف بزرگ سیدنا عبید اللہ بن الحسن عنبریؒ (ف ۱۶۸ھ) کے حالات و واقعات میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ ان کی عدالت میں امیر المؤمنین مہدی ایک مقدمہ لے کر اپنے فریق کے ساتھ حاضرِ عدالت ہوئے اور اسی جگہ پر بیٹھے جہاں مدعی اور مدعا علیہ بیٹھا کرتے تھے اور قاضی نے حاکمِ وقت کو بغیر کوئی پروٹوکول دیے مقدمہ کی سماعت کی۔(۵)

قانونی مساوات اور آزاد عدلیہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات' اسوۂ رسولؐ اور خلفائے راشدین کا طرزِ عمل ایسا بے لچک اور دوٹوک تھا کہ اس سلسلے میں ہلکی سی تقصیر بھی گوارا نہ

کی جاتی اور اگر کسی جج سے بتقاضائے بشریت کبھی کوئی کوتاہی ہو جاتی' جو بظاہر غیر جانبداری کے منافی نظر آتی تو وہ اس پر پشیمانی اور ندامت محسوس کرتا۔ اس سلسلے میں سیدنا ابو یوسفؒ کا یہ واقعہ لائقِ مطالعہ ہے:

''انتقال کے وقت امام ابو یوسف نے دعا کی ''اے اللہ تو جانتا ہے کہ ایک واقعہ کو چھوڑ کر میں نے کبھی فریقین کے درمیان انصاف اور مساوات کی روش ترک نہیں کی۔ پس اے اللہ اس واقعہ میں بھی جو گناہ مجھ سے صادر ہو گیا اسے تو معاف فرما دے''۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے۔ حضرت الامامؒ نے جواب دیا: ''ایک عیسائی نے امیر المؤمنین کے خلاف دعویٰ کیا۔ امیر المؤمنین اس مجلس میں پہلے سے موجود تھے۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ میں امیر المؤمنین کو حکم دیتا کہ جا کر اس مدعی کے ساتھ کھڑے ہوں بلکہ میں نے اس عیسائی کو اٹھا کر فرش کے کنارے پر بلا کر بٹھایا' جہاں تک قریب بٹھانا ممکن تھا۔ پھر میں نے مقدمہ کی سماعت کی اور ہر دو فریق کو برابر نہ بٹھا سکا۔ پس اس مدعی پر یہ میرا ظلم ہوا''۔ (٦)

مندرجہ بالا واقعات سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

(۱) یہ عدل و انصاف کا بنیادی تقاضا ہے کہ جب ایک مقدمے کے فریقین جج کے سامنے حاضر ہوں تو اسے ہر ایک سے گفتگو' توجہ' بٹھانے اور دیکھنے میں بھی مساوی سلوک کرنا چاہیے۔ خواہ فریقین میں سے کوئی امیر ہو یا غریب' عالم ہو یا جاہل' حاکم ہو یا محکوم اور چاہے مسلم ہو یا کافر۔

(۲) حاکمِ وقت کو بھی عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے' لہٰذا اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش اسلام کے نظامِ عدل میں نہیں ہو سکتی کہ سربراہِ ریاست کو مقدمے کا فریق بنا کر عدالت میں نہیں بلایا جا سکتا۔ ایسا کہنے والے یا تو عدل و انصاف کی اسلامی تاریخ اور شریعت کی تعلیمات سے بے خبر ہیں' یا پھر تجاہل عارفانہ سے کام لے کر حاکمِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پہلی صورت میں انہیں اپنی لاعلمی کا ازالہ کرنا چاہیے اور دوسری صورت میں اپنے کردار و عمل کی اصلاح کر کے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ دنیوی جاہ و منصب ایک عارضی اور فانی چیز ہے' حقیقی عزت و اقتدار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ عدل و انصاف پر قائم رہنے سے ہی مل سکتا ہے۔

المختصر نظامِ قضاء کی کامیابی اور تمام طبقہ ہائے انسانی کو عدل و انصاف کی یقینی فراہمی محض

اسی صورت میں ممکن ہے جب عدلیہ امراء وحکام کے اثر ونفوذ اور ہر قسم کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہو اور جج صاحبان پورے اعتماد اور غیر جانبداری سے مقدمات کے فیصلے کریں۔ آج اگر ہم بحیثیتِ ملت رفعت و بلندی، عظمت وشوکت اور دنیا کی امامت کا منصب پانا چاہتے ہیں تو ہمیں قرونِ اولیٰ کا نظامِ عدل وانصاف قائم کرنا ہوگا جس میں سربراہِ مملکت سے لے کر عام شہری تک کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے یکساں طور پر جواب دہ ہوں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو موجودہ ذلت ونکبت سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہ مل سکے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کفر کی حکومت تو برداشت کر لیتا ہے لیکن ظلم پر مبنی حکومت واقتدار کو نیست ونابود کر دیا کرتا ہے۔ یہی سنتِ الٰہی ہے: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ (فاطر:٤٣) ''اور تم سنتِ الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر وتبدل نہ پاؤ گے''۔

حواشی

(١) السياسية الشرعية، ص ٧۔
(٢) الطرف الحكمية، ص ١٧۔
(٣) الكامل لابن اثير، ص ٣٩٩، ج٣۔
(٤) بيهقي، جلد ١٠، ص ١٤٤۔وادب القاضي، ج٢، ص ٢٥٢۔
(٥) ادب القاضي للماوردي، ج١، ص ٢٤٨۔
(٦) مبسوط للسرخسي ج١٦، ص ٦١۔

حکمرانوں کے خلاف خروج کا مسئلہ

جواد حیدر ☆

کسی بھی باشعور اور مہذب قوم کا سربراہ بے شعور اور غیر مہذب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ظلم و تعدی اور سفاکیت کا سہارا لے کر بزورِ قوت کوئی حکمران مسندِ حکومت پر قابض ہو جائے اور وہ عقل و شعور سے بھی پیدل ہو، مزید یہ کہ اُن بنیادوں کو بھی ہلا کر رکھ دے جن پر وہ قوم یا ملک قائم ہے، تو اسے سنجیدہ، عقل مند اور باشعور لوگ قبول نہیں کرتے۔ اس سے زمامِ اقتدار چھیننے کے لیے ہر طرح کی کوششوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ دین اسلام چونکہ فطری دین ہے، اس لیے اس نے بھی ایسے حکمرانوں کو قطعاً برداشت نہیں کیا اور ایسے اصول وضوابط دیے ہیں جو عادل اور امین حکمرانوں کو مضبوط سے مضبوط کرتے ہیں اور ظالم و سفاک حکام کو نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ نااہل حکمرانوں کو اُن کی مسانیدِ حکومت سے اتارنے کی ہر کوشش ''خروج'' کہلاتی ہے۔ یہ کوشش اور جہد پُرامن طریقے سے بارآور ہو جائے تو فبہا، ورنہ قوت کے استعمال کے تقاضے پورے ہونے پر بزورِ طاقت ظالم حکام کو کرسیٔ اقتدار سے کھینچ ڈالا جاتا ہے۔ زیرِنظر تحریر خروج کی شرعی حیثیت پر مبنی ہے جو شیخ عبدالمنعم مصطفیٰ حلیم ابوالبصیر کی کتاب ''فصل الکلام فی مسئلة الخروج علی الحکام'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ تحریر دورِ حاضر کی مسلم دنیا کو خوابِ غفلت سے جگانے میں اِن شاء اللہ ممد ہوگی، تاکہ وہ ان ظالم حکمرانوں کو نیست و نابود کر دیں جو مسانید حکومت پر بیٹھ کر دین اسلام کا تیا پانچا کر ڈالنے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔

حکمرانوں کے خلاف مسئلہ خروج اور اس بارے میں شرعی موقف اُن اہم ترین مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں لوگوں کی اکثریت دو مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ افراط و غلو پر مبنی ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ خلافِ شرع معمولی سے واقعہ پر بھی حکام کے خلاف خروج واجب ہوگا۔ اس موقف کے حاملین خارجی اور ان کے حلقے میں شامل

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، قرآن اکیڈمی لاہور

ایسے افراد ہیں جو خوارج اور ان کے منہج سے متأثر ہیں اور تشدد کی طرف مائل ہیں۔

جبکہ دوسرے گروہ کا میلان، پہلے گروہ کے برعکس، اس حد تک تفریط کی جانب ہے کہ وہ کافر اور مرتد طاغوتوں کے خلاف بھی خروج جائز نہیں سمجھتے، بلکہ مرجیہ وجہمیہ کی سی تأویلیں کرتے ہیں، نیز اِن حکام کی صورت حال کو بنواُمیہ اور بنوعباس کے حکمرانوں پر قیاس کرتے ہیں۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس نے اس مسئلہ میں افراط و تفریط کی طرف مائل ہوئے بغیر کتاب وسنت میں منصوص حق اور درست راہ کو اپنایا ہے اور اہل سنت والجماعت کے موقف کو اختیار کیا ہے۔

اس اہم مسئلہ سے متعلق بحث ہٰذا میں ہمارا مقصود تیسرے گروہ یعنی اہل سنت والجماعت کے موقف کو بیان کرنا ہے، جس پر کتاب وسنت کی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ اسی پر ہمارا اعتقاد ہے اور یہی ہمارا طرزِ عمل ہے اور اسے ہی ہم درست اور حق جانتے ہیں۔

اس اہم بحث میں تمام امور کے اثبات وتحقیق میں ہم اِن شاء اللہ کتاب وسنت کے شرعی دلائل اور اُمت کے علماءِ سلف کے راجح اقوال کا التزام کریں گے۔

میری رائے کے مطابق حکام کی چار اقسام ہیں:

(۱) کافر حکمران (۲) مسلم حکمران

(۳) مسلم فاسق حکمران (۴) انتہائی فاسق وفاجر اور ظالم حکمران

حکام کی اِن تمام اقسام میں سے ہر ایک کا حکم دوسری سے مختلف ہے اور اب بالتفصیل اس کی وضاحت پیش خدمت ہے۔

کافر حکمران

مسلم ممالک پر قابض کافر حکمران کے خلاف قوت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونا مسلمانوں پر نصاً اور اجماعاً واجب ہے، چاہے اس کا کفر کفرِ اصلی ہو یا بسببِ ارتداد، یہاں تک کہ اسے اپنے موقف کے مطابق قائل کر لیا جائے یا پھر وہ ایسا مسلم عادل حکمران بن جائے جو ملک وملت پر اسلام اور اس کے مطابق فیصلے کرے۔ اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ (النساء)

''اور اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر غلبے کی راہ ہرگز نہ دے گا''۔

کفار کا مؤمنین پر غلبے کی راہ پا لینے سے مراد اُن کا ایسے حاکم اور امیر بن جانا ہے جو مسلمانوں کے فیصلے اپنی خواہشات کے مطابق (خود ساختہ) قوانین اور اصولوں کی روشنی میں کریں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تُطِيعُوٓا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۙ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيۡنَ يُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا يُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾﴾ (الشُّعراء)

''اور تم حد سے گزر جانے والوں کی اتباع نہ کرو؛ جو زمین میں فساد تو کرتے ہیں اصلاح نہیں کرتے۔''

کفر و فساد کے اصولوں پر عوام الناس کی حکمرانی کرنے والے کفار و مرتد طاغوتوں کے ظلم اور فساد سے بڑھ کر زمین میں اور کوئی ظلم و فساد نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾﴾ (آل عمران)

''اے مؤمنو! اگر تم کافروں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو الٹے پاؤں (کفر کی طرف) پھیر دیں گے تو تم گھاٹے میں پڑ جاؤ گے۔''

ایسا حاکم حاکم نہیں ہوتا جس کا کہا اور حکم نہ مانا جائے' اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات بڑی وضاحت سے بیان کر دی ہے کہ کفار کی اطاعت کا انجام دین سے انحراف ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾﴾ (الانعام)

''اور اگر تم نے بھی ان کا کہا مان لیا تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔''

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ایک متفقٌ علیہ حدیث میں ہے' انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں طلب فرمایا اور ہم سے بیعت لی' جس میں آپؐ نے ہم سے یہ اقرار لیا کہ ہم خوشی و غمی' تکلیف و آسانی ہر حال میں حکم مانیں گے اور اس پر عمل بھی کریں گے خواہ ہماری حق تلفی ہو (ہمارے اوپر کسی اور کو ترجیح دی جائے) اور یہ کہ حاکم سے جھگڑا نہ کریں گے اِلّا یہ کہ من جانب اللہ دلیل کی بنیاد پر اُن میں واضح کفر دیکھ لیں۔(۱)

حدیث صراحت سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حاکم سے حکومت و ولایت کے کسی

معاملہ میں جھگڑا نہیں کیا جا سکتا' سوائے اس کے کہ ہم اس میں ایسا صریح کفر پائیں جو نہ تو تأویل کا متحمل ہو اور نہ ہی کسی اور معنی کا' اور اس کے کفر پر ہمارے پاس کتاب وسنت سے واضح دلیل بھی ہو۔ اور اگر اس میں کفر صریح کی موجودگی متحقق ہو جائے تو نہ تو اس کا حکم مانا جائے گا اور نہ ہی اس پر عمل کیا جائے گا۔ اور یہ کہ حکومت وولایت کے معاملہ میں اس سے تنازع کرنا اور تلوار کی قوت سے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا از خود جائز ٹھہرے گا۔

ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ جب حاکم کفر صریح کا ارتکاب کرے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی' بلکہ بقدرِ استطاعت اس کے خلاف (خروج کی) کوشش کرنا لازم ہوگا۔[۲]

صحیح مسلم کی شرح میں امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ کافر کی امامت منعقد نہ ہونے پر علماء کا اجماع ہے اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ اگر اس پر کفر لاحق ہو جائے تو بھی معزول کر دیا جائے گا۔ مزید اُن کا یہ کہنا بھی ہے کہ اگر وہ اقامت صلوٰۃ اور اس کی طرف بلانے کو بھی چھوڑ دے تو بھی اسی زمرے میں آئے گا[۳]۔ میرا خیال ہے کہ قاضی عیاضؒ کا اقامت صلوٰۃ اور اس کی دعوت کے ترک سے اشارہ صحیح مسلم کی اس حدیث کی طرف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سَتَكُوْنُ اُمَرَاءَ فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ وَمَنْ اَنْكَرَ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ)) قَالُوْا: اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ : ((لَا' مَا صَلُّوْا))

''عنقریب ایسے حکام ہوں گے کہ تم ان کے اچھے اعمال کو اچھا اور برے اعمال کو ناپسند جانو گے۔ تو جس نے ان کے برے اعمال کو پہچان لیا (اور انہیں ہاتھ یا زبان سے روکا) تو وہ بری ہو گیا' اور جس نے ان کے اعمال کو (دل سے) برا جانا وہ بھی سلامت رہا' البتہ جس نے ان کے برے اعمال کو اچھا جانا اور ان کی پیروی بھی کی (وہ فتنے میں پڑ گیا)'' صحابہ کرامؓ نے پوچھا: کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ فرمایا: ''نہیں' جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں (تم ان سے قتال نہ کرنا)۔''

اور صحیح مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ:

''تب تک تم ان کے خلاف قتال نہ کرنا جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے ہیں.....الخ''[۵]

گویا یہ بات حدیث سے ثابت ہے کہ جب حاکم نماز کا تارک ہو جائے اور نماز کا حکم دینا بھی بند کر دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور نتیجتاً اس کے خلاف خروج کرنا اور تلوار نکال لینا درست ٹھہرتا ہے۔

خروج کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں

اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان اس کے خلاف خروج کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو پھر کیا کرنا ہوگا؟ تو میرا خیال ہے کہ ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں پر تین طرح کے امور لازم ہوں گے۔

(۱) فکری وعملی تیاری

حسب استطاعت فکری وعملی تیاری کرنا جس سے حکام کے خلاف خروج' ان سے نجات اور اُمت کو اُن کے کفر وشر سے چھٹکارا ممکن ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ﴾ (الانفال: ٦٠)

''اور (اے مسلمانو!) تم کافروں کے (مقابلے کے) لیے مقدور بھر طاقت تیار رکھو اور گھوڑے باندھ رکھو' اس سے اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر تمہاری دھاک بیٹھ رہے گی اور اِن کے علاوہ اُن پر بھی جنہیں تم تو نہیں جانتے اللہ جانتا ہے''۔

سید قطبؒ نے اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں لکھا ہے کہ حتی المقدور تیاری کا فریضہ جہاد کے فریضے سے ملحق ہے۔ اور یہ نص مختلف اصناف وانواع اور اسباب سے منسلک امور میں تیاری سے متعلق حکم دیتی ہے۔ نیز فرمایا کہ طاقت کی حد سے مراد انتہائی کوشش ہے' یہاں تک کہ مسلمان قوت کے تمام اسباب اس میں صرف کر دینے سے پیچھے نہ رہیں(٦)۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ کافر حکمران کے خلاف خروج سے عجز اُس کے خلاف مقدور بھر تیاری نہ کرنے کا جواز فراہم نہیں کرتا۔ کیونکہ **الميسور لا يسقط بالمعسور** ''تنگی آسانی کو زائل نہیں کرتی''۔ اور اس بارے میں دلیل اللہ رب العزت کا یہ فرمان ہے کہ:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦)

''اللہ سے جتنا ڈر سکتے ہو ڈرو''۔

اور متفق علیہ حدیث ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''میں تمہیں جس بات کا حکم دوں تم حسبِ استطاعت اسے پورا کرو''۔

العز بن عبدالسلامؒ اپنی کتاب ''قواعد الاحکام'' میں فرماتے ہیں کہ جسے کسی بات کا مکلّف ٹھہرایا جائے اور وہ اس کے بعض حصے کو ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور بعض حصے سے عاجز ہو' تو

وہ اسے ہی ادا کرے گا جس کی وہ طاقت رکھتا ہو اور جس حصے سے عاجز ہے اس سے وہ ساقط ہو جائے گا۔(۷)

ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ جہاد میں بوقت عجز قوت اکٹھی کرنا اور گھوڑوں کی تیاری جیسے امور بجالانا لازم ہو جاتا ہے' کیونکہ ''ان ما لا یتم الواجب الا به فهو واجب''یعنی جس کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے۔(۸)

(۲) حکمرانوں سے علیحدگی

دوسرا یہ ہے کہ اس کافر حکمران سے علیحدہ ہو جایا جائے۔اس کے ہاں یا اس کے ساتھ کام ترک کر دیا جائے' یعنی ایسے امور چھوڑ دیے جائیں جس سے اس کی سلطنت مضبوط ہو یا ملک پر اور لوگوں پر اس کا اثر بڑھے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے بعد تم پر ایسے حکمران آئیں گے کہ بغیر علم کے کچھ نہیں کہیں گے اور بغیر جانے کچھ نہیں کریں گے' تمہیں ان کی اطاعت کرنا ہوگی۔اسی طرح تم ایک عرصہ گزار دو گے' پھر تم پر ایسے حکمران مسلط ہوں گے کہ وہ ایسی بات کہیں گے جس کا انہیں علم تک نہ ہوگا اور ایسے اعمال کریں گے جن کی انہیں معرفت نہ ہوگی۔تو جو اُن کی ہمدردی کرے گا' انہیں قوت پہنچائے گا اور ان کی طاقت کو مضبوط کرے گا تو وہ خود بھی ہلاک ہو گیا اور اس نے دوسروں کو بھی ہلاک کر دیا۔البتہ تم ان کے درمیان رہو' لیکن اپنے اعمال سے انہیں نابود کر دو اور نیکوکاروں کی نیکی اور بروں کی برائی پر گواہ رہنا''۔(۹)

نیز فرمایا:

''یقینی طور پر تم پر ایسے حکمران آئیں گے جو برے ترین لوگوں کو قریب کریں گے' نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کریں گے۔اگر کوئی شخص ان میں یہ چیز پائے تو وہ نہ تو منتظم بنے' نہ کوتوال (پولیس آفیسر)' نہ محصل (ٹیکس وصول کرنے والا) اور نہ ہی خزانچی۔''(۱۰)

نیز فرمایا:

''لوگو سنو! کیا تمہیں علم ہے کہ میرے بعد ایسے (برے) امراء آئیں گے؟ تو جو اُن میں رہا اور ان کے جھوٹوں کو سچا گردانا اور ظلم پر ان کی مدد کی تو وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے بری ہوں۔وہ میرے پاس حوضِ کوثر پر بھی نہ آ سکے گا۔اور جو اُن امراء میں نہ گیا اور ظلم پر ان کی مدد بھی نہ کی اور ان کے جھوٹ کو سچ نہ کہا تو وہ مجھ سے اور میں اس سے ہوں' مزید یہ کہ وہ میرے پاس حوضِ کوثر پر بھی آئے گا''۔(۱۱)

اورفرمایا:

''عنقریب ایسے امراء آئیں گے کہ تم میں سے بعض لوگ تو اُن کی حالت کو جانتے ہوں گے اور بعض نہ جانتے ہوں گے' تو جس نے انہیں ترک کر دیا وہ کامیاب ہو گیا اور جو اُن سے جدا رہا وہ سلامت رہا اور جو اُن میں گھل مل گیا وہ ہلاک ہو گیا''۔(۱۲)

اگر یہ کہا جائے کہ متذکرہ بالا احادیث تو ظالم امراء کے ساتھ خاص ہیں؟ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ یہ احادیث کفار اور سرکش حکمرانوں پر تو بالا ولیٰ صادق آتی ہیں۔

(۳) کافر حکام کے قوانین کا انکار

ان کے آئین اور قوانین ونظام کو برضا تسلیم نہ کیا جائے' ان کے بارے میں ایسی بات نہ کی جائے جو اعترافِ حاکمیت کا فائدہ دے کہ ہاں وہی ملک وقوم کے حاکم ہیں' اور یہ کہ انہیں فرمانروائے مملکت' بادشاہِ معظم وغیرہ ایسے عزت وتعظیم کے القابات سے مخاطب کرنا' جس سے ان کی سیادت وقیادت اور نظام کو قبول کر لینے کا مفہوم نکلتا ہو' درست نہیں۔ اور اگر کچھ لوگ (ان سے الگ رہنے کے) اس رویے کو اپنا لیں اور اس پر اتفاق کر لیں تو ضروری ہے کہ ان کا ساتھ دیا جائے' کیونکہ یہ حکمرانوں کے جلد زوال اور ان کے ملک وقوم سے چھٹکارے کا سبب ہوگا۔

مزید برآں ان کے آئین وقانون کا اعتراف کفریہ دستور کو تسلیم کرنا ہے اور یہ ان کی حمایت پر دلیل ہے۔ نیز کفر سے اظہارِ رضامندی اتفاقاً کفر ہے۔ یہ جائے لغزش کا ایسا خطرناک گڑھا ہے جس سے اللہ کی پناہ' اور اس میں وقوع بہت ہی خطرناک معاملہ ہے۔

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کو سیدنا (ہمارا سردار) مت کہو' کیونکہ اگر وہ تمہارا سردار بن گیا تو تم نے اپنے ربّ کی نافرمانی مول لی۔(۱۳)

ایک روایت میں ہے کہ ''جب کوئی شخص کسی منافق کو جناب صدر کہتا ہے تو وہ گویا اپنے رب کو غصہ دلاتا ہے''۔ یعنی اگر تم ایسا پیرایۂ اظہار اپناتے ہو جو یہ مفہوم ادا کرے کہ منافق تمہارا سردار ہے تو گویا تم نے اپنے ربّ کو ناراض کیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تو منافق کے بارے میں ہے جو اسلام کا اظہار کرتا ہے' جبکہ کافر ومرتد حاکم مسلمانوں پر متمکن ہو جائے تو مسلمان جہاد سے کیسے رک سکتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تو بالا ولیٰ ربّ تعالیٰ کی نافرمانی میں داخل ہیں۔

جب کسی آدمی کا منافق کو ''یا سید'' کہنا خدا کے غضب کو دعوت دینے کا سبب ہے تو

اصحاب کفر وارتداد ایسے طاغوتوں کو بڑے بڑے القابات اور دلکش تعریفات سے نوازنا اور قابل ولایت جاننا کیا انجام رکھتا ہوگا؟ جیسا کہ آج کل بہت سے لوگوں کا وطیرہ ہے۔

بعض اشکالات واعتراضات کا جائزہ

(۱) پہلا اشکال: حکام کے خلاف خروج فتنہ برپا کرنا ہے

طاغوت اور مرتد حکمرانوں کے خلاف جہاد کے باب میں جو شبہات پھیلے ہیں یا افواہ پھیلانے والوں کی طرف سے گھڑے گئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ کفار کے خلاف خروج فتنے کو ہوا دینے، خون ریزی کرنے، لڑائی بھڑائی اور بے شمار مصالح کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ اور ان جیسے اور بھی بہت سے اشکالات اور اعتراضات ہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

جواب: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کبھی ''حکمرانوں کے خلاف خروج'' کا لفظ سنا بھی نہیں، لیکن آپ انہیں اس معاملے میں بہت محتاط اور یہ کہنے والا پائیں گے کہ یہ تو سراسر فتنہ ہے، اور جو اِس سوئے ہوئے فتنے کو جگائے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

یہ فضول اور بے کار اشکال ہے جس پر ہم کئی انداز سے محاکمہ کرتے ہیں۔

☆ ترک جہاد حقیقی فتنہ ہے: ایک تو یہ کہ حقیقی فتنہ تو جہاد کو ترک کرنا اور کفر وارتداد کے طاغوتوں کے خلاف جہاد کرنے سے منہ پھیرنا ہے، اور رہا بہانہ باز، تارکِ جہاد تو وہ اس فتنے کا بالاولیٰ شکار ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اے جد (جد بن قیس)! کیا بنو اصفر کے علاقے میں (جہاد کے لیے) جاؤ گے''۔ جد نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ میرے لیے رخصت نہیں فرما دیتے، کیونکہ میں عورتوں سے محبت کرنے والا شخص ہوں، کہیں بنو اصفر کی خواتین میں جا کر فتنے کا شکار نہ ہو جاؤں! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس سے اعراض برت رہا ہے، جاؤ تمہیں اجازت ہے''۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ اتری:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ﴾

(التوبۃ:۴۹)

''اور ان میں سے بعض کہتے ہیں مجھے اجازت دے دیجیے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے۔

خبردار! یہ تو خود فتنے میں گھرے ہوئے ہیں''۔(۱۴)

میرا یہ کہنا ہے کہ یہ تو طلب اجازت اور بعد از اجازت فتنے میں پڑے ہوئے ہیں' تو کیا خیال ہے ایسے شخص کے بارے میں جو بغیر اجازت طلب کیے اور بغیر پرمٹ لیے جہاد چھوڑے بیٹھا ہے؟ اس میں کوئی شک والی بات نہیں کہ یہ تو بالا ولیٰ فتنے کا شکار ہے۔ ☆

☆ **کفر و شرک کا فتنہ ہر فتنے سے بڑا ہے**: مزید یہ کہ کفر اور شرک کا فتنہ حاکموں کے کفر اور ان کے دیے گئے کفریہ نظام سے آتا ہے' جس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں—— اور ایسا شر ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی شر نہیں—— ایسی مصیبت ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ یہ فتنہ ایسی عظیم مصالح کے لیے زہر ہلاہل ہے جن سے بڑھ کر کوئی مصالح نہیں—— اس فتنے کے خاتمے کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ اور ہر آزمائش ہلکی تر ہے۔ یہ نصاً اور اجماعاً اکبر الکبائر میں سے ہے اور سب سے بڑا گناہ ظلم ہے۔ اور یہ وہ گناہ ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کے سوا مغفرتِ الٰہی کے لیے اور کوئی چارہ نہیں اور اگر شرک پر ہی مر گیا تو ابدالآباد کے لیے جہنم کی آگ میں دھونسا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ (لقمٰن)

''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ﴾

(النساء:۴۸'۱۱۶)

''بے شک اللہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اِس کے علاوہ جس کے لیے جو چاہے معاف کر دے''

اسی کی بیخ کنی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کو مشروع ٹھہرایا—— یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور سارے کے سارے نظام اللہ کے لیے ہو جائیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

☆ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ نزولِ آیت کے زمانہ میں امیر موجود تھے جن سے اجازت ضروری تھی یا جن کی معیت میں قتال جائز تھا' لیکن آج کے دَور میں کس سے اجازت طلب کی جائے گی اور کس کی قیادت میں قتال ہو گا؟ اور یہ کہ بغیر شرعی امیر کے اور بغیر دیگر شرائط پوری کیے خروج یا قتال کیا جائے تو کیا اس کا لازمی نتیجہ انارکی نہ ہو گا؟ (مترجم)

''اوران سے لڑو جب تک فتنے کی جڑ نہیں اکھڑ جاتی اور سارے کا سارا دین اللہ کا نہیں ہو جاتا''۔

بنی اسرائیل جب شرک اور بچھڑے کی عبادت میں پڑے تو اللہ ربّ العزت نے انہیں اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد موحدین نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کیا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ (البقرۃ:٥٤)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر بڑا ہی ظلم کیا ہے' لہٰذا اپنے خالق کی طرف پلٹ آؤ اور اپنے آپ کو قتل کرو' یہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے''۔

اس لیے بسا اوقات قتال کی بڑی سے بڑی آزمائش بھی شرک کے فتنہ وفساد کے مقابلے میں ہلکی لگتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ (البقرۃ:١٩١)

''اور فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے''

نیز فرمایا:

﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ﴾ (البقرۃ:٢١٧)

''اور فتنہ تو قتل سے زیادہ بڑا ہوتا ہے''

گویا کفر وشرک کا فتنہ قتل وقتال اور اس سے پہنچنے والے آلام ومصائب سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ جہاد میں جانیں تو جاتی ہیں اور لوگ شہید ہوتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ جو چیز مبنی بر کفر وشرک اور راہِ حق سے روکنے والی ہے وہ قتل سے بھی زیادہ سخت' شدید اور خوفناک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا:

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ (البقرۃ:١٩١)

''اور فتنہ تو قتل سے زیادہ سخت ہوتا ہے''۔

ابو عالیہ' مجاہد' سعید بن جبیر' عکرمہ' حسن' قتادہ' ضحاک اور ربیع بن انس رحمہم اللہ کا اس آیت کے بارے میں فرمانا ہے کہ شرک قتل سے بھی زیادہ سخت ہوا کرتا ہے۔

☆ کافر و طاغوت حکمرانوں کا باقی رہنا بڑا فتنہ ہے: ان ظالم طاغوتوں کے خلاف جہاد سے رکے رہنے کا نقصان ان کے خلاف جہاد اور خروج سے کہیں بڑھ کر ہے اور اس پر شریعت کی نصوص شاہد ہیں جو اس موقف کے مطلقاً درست ہونے پر بول بول کر گواہی دے رہی ہیں' اور بعض ایسی واقعاتی شہادتیں بھی ہیں جو اِن نصوص کی تائید کرتی ہیں۔

ماقبل دلائل پر مستزاد بعض منصوص شہادتیں درج ذیل ہیں۔ اللہ ربّ العزت نے فرمایا:

﴿اِلَّا تَنفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٣٩﴾﴾ (التوبة)

''اگر تم نہ نکلے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دے گا اور تمہارے علاوہ ایک نئی قوم لے آئے گا' اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

صحیح حدیث نبویؐ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا تَرَكَ قَوْمٌ الْجِهَادَ اِلَّا عَمَّهُمُ اللّٰهُ بِالْعَذَابِ))(١٥)

''کسی قوم نے جب بھی جہاد سے منہ پھیرا تو اُن پر عام عذاب مسلط کر دیا گیا''۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِيْنَةِ وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيْتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ)) (١٦)

''جب تم جنگی ساز و سامان بیچ کر بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے' اور کھیتوں کو پسند کرنے لگو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو اللہ تم پر ذلتیں مسلط کر دے گا' اور جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ نہیں آ ؤ گے تم سے ذلتیں دور نہ کرے گا''۔

نیز ارشاد فرمایا:

((مَنْ لَّمْ يَغْزُ اَوْ يُجَهِّزْ غَازِيًا اَوْ يَخْلُفْ غَازِيًا فِىْ اَهْلِهٖ بِخَيْرٍ اَصَابَهُ اللّٰهُ بِقَارِعَةٍ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ)) (١٧)

''جس نے کبھی جہاد نہ کیا' نہ ہی کسی غازی کو تیار کیا اور نہ ہی غازی کے گھر بار کی بہتر نگرانی کے لیے پیچھے رہا' قیامت سے پہلے اللہ اسے ضرور کسی مصیبت میں گرفتار کرے گا''۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''عنقریب قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں گی جیسے بسیار خور کھانے کی میز پر ٹوٹتا ہے''۔ پوچھا گیا: کیا ہماری قلت کے سبب ایسا ہوگا.....؟ فرمایا: ''نہیں' بلکہ تم اس دن بہت زیادہ ہو گے لیکن سمندر میں جھاگ کی مانند' اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہارا رعب مٹا دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن ڈال دے گا''۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! یہ وہن کیا ہے؟ فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے کراہت''۔ (۱۸)

یہ تو رہیں نصوص شرعیہ کی شہادتیں ـــــ اب ہیں واقعاتی شہادتیں ـــــ جن کا تذکرہ فائدے سے خالی نہیں' کہ جب بھی ظالم طاغوتوں کو قبائل پر حکومت کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا اور یہ قبائل ظالموں کا ہاتھ روکنے سے دست بردار ہو گئے' ہر بھلی چنگی' جس کے وہ مالک تھے' انہیں پیش کر دی' اپنا دین' عزت' اولاد' اراضی' مال' شوکت وسطوت اور وہ سب کچھ جو اُن کے پاس تھا' ان پر لٹا دیا' لیکن طاغوت ''مزید' مزید'' پکارتا رہا۔ مسلمانو! یاد رکھو یہ طاغوت پھر بھی راضی نہ ہوگا' نہ ہی تم سے مطمئن ہوگا' یہاں تک کہ تمہیں تمہاری ہر شے سے بے دخل کر دے اور من جملہ اپنی بندگی واطاعت بلکہ اندھی اطاعت وفرمانبرداری میں لے جائے۔

یہ زمین سے چمٹے رہنے اور طاغوت سے جہاد نہ کرنے کا نقصان ہے۔ رہا جہاد کرنے کا وقتی نقصان' تو کاش سمجھ آ جائے کہ اس میں جو کچھ بھی ہو جائے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ یا تو فتح کی شکل میں یا پھر شہادت کی صورت' ہر دو پہلوؤں سے کامیابی اور عزت وعظمت ہی ہے۔

اور اگر یہ بات کہی جائے جیسا کہ عموماً کہی جاتی ہے' کہ ذرا اِن خوفناک نتائج کی طرف بھی دیکھئے جو بعض ممالک میں جہاد کرنے سے سامنے آئے یا طاغوت حکمرانوں کے خلاف خروج سے حاصل ہوئے اور یہ علاقے اور لوگ کن کن مفاسد کا شکار ہوئے؟؟ تو ہم آپ کی باتوں اور ان حالات میں کیسے مطابقت دے سکتے ہیں؟؟

تو میرا کہنا یہ ہوگا کہ ان ممالک میں جن بہت سے مفاسد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے ان مفاسد کے پھیلنے کا سبب راہِ خدا میں جہاد اور طاغوت حکمرانوں کے خلاف خروج نہیں بلکہ برائی پر ابھارنے والا ہمارا اپنا نفس ہے۔

جہادی تحریکوں اور تنظیموں کی ناکامی کے اسباب

جن اسباب کی بنا پر دورِ حاضر کی بعض تحریکوں کو سرنگوں ہونا پڑا اس حوالے سے میں خلاصۃً درج ذیل نکات میں اپنا موقف بیان کیے دیتا ہوں:

(۱) مطلوبہ تعداد پوری ہونے سے پہلے ہی اقدام کر دینا جبکہ معروف ہے کہ ''من **تعجل شیئا قبله اوانه عوقب بحرمانه**'' یعنی جو قبل از وقت کسی شے کے حصول کی کوشش کرتا ہے اسے اس سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

(۲) دائرہ عمل کا مجاہدین کی طاقت اور صلاحیت سے زیادہ بڑا ہونا' جس کے سبب اہم محاذوں پر لڑنے کی بجائے ان کی اپنی قوت وطاقت کے کئی طرح سے تار و پود بکھر گئے۔

(۳) دورِ حاضر کی جن جاہلی طاقتوں نے انہیں گھیر رکھا ہے ان کی قوت اور وسائل کا غلط اندازہ لگانا اور پھر محض توکل کے جذبات سے ان کا مقابلہ کرنا۔ (جو توکل نہیں تو اکل ہے)

(۴) جہادی کارروائیوں کے بارے میں ہمارے ہاں ایسے غلط افکار و نظریات کا پیدا ہو جانا جو انحراف وضلالت اور گمراہی کی جانب لے گئے۔

(۵) غلط طرزِ عمل —— بالخصوص ایسا رویہ جو انتہا پسند خارجیوں کے باطل اصولوں پر استوار ہے۔

(۶) ''دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے'' کے اصول پر مشکوک اور خفیہ اداروں سے غیر واضح معاہدے —— جن میں سے بیشتر کافر و مرتد ہیں۔ اسی بنا پر جہادی لشکروں کو کارروائیوں کے نتائج حاصل کیے بغیر الٹے پاؤں لوٹنا پڑا' خاص طور پر جب ثمر آوری کا وقت تھا۔

(۷) مبادیات واخلاقیات اسلام' اللہ کی راہ میں جہاد اور دیگر مقدس امور (جن کی بنا پر اللہ ربّ العزت کی جانب سے مدد اترا کرتی ہے) میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر سست روی۔

(۸) مسلمانوں کی اکثریت کا مجاہدین کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لینا اور تماش بینوں کی لغویات پر اکتفا کر بیٹھنا۔ اس امر کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں' مثلاً معرکوں کے حالات و وقائع' دشمن کی عادات' اسلامی احکام اور ان کے شرعی فرائض سے بے خبری' خوف' افواہ سازوں کی اڑائی گئی ہوائیاں' طاغوتوں کی گود اور ان کی قطاروں میں موجود ایک خاص اثر رکھنے والے علماءِ سوء' جن کا عوام پر بھی نمایاں اثر ہے' فرقوں اور جماعتوں میں پیدا ہو جانے والے فقہی اختلافات جو محض استحباب کی بنیاد پر ہیں کہ ایک گروہ ایک کو مقدم سمجھتا ہے دوسرا دوسرے کو' جس سے بہت ہی قبیح نتائج سامنے آئے ہیں جو نہ تو ہمارا مقصود ہیں اور نہ ہی ہمیں پسند ہیں' اور انہی میں سے ایک بڑا گروہ ہمیشہ اس پر نظر رکھتا ہے اور منتظر رہتا ہے کہ کس فریق کا پلڑا بھاری ہوگا؟ کون دوسرے پر غالب آئے گا؟ اور وہ ہمیشہ فاتح کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ مالِ مفت اور تقسیم کار

میں وہ بھی شریک ہو سکے' قطع نظر اس کے کہ فتحیاب طاغوت و مرتد تو نہیں۔

اجمالاً یہ وہ اسباب ہیں جو دورِ حاضر کی جہادی تحریکوں کو پستی و شکست اور منفی اثرات و غلط تجربات کی طرف لے گئے' آج جنہیں ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔اس پر ہم نہ تو راضی ہیں اور نہ ہی عقل و دین اس کی تائید کرتے ہیں۔

یہ بڑا ہی ظلم اور زیادتی ہے کہ ہمیں جہاد فی سبیل اللہ کے آغاز ہی میں اپنی خطاؤں' غلطیوں اور کوتاہیوں کو برداشت کرنا پڑا ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ ہم اسے جہاد کے آثار و نتائج گردانے لگے اور ہم نے اپنی کوتاہیوں' ہوس پرستیوں اور صحیح ربانی منہج سے انحراف کو اس کے اسباب و وجوہات نہ خیال کیا اور نہ ہی ان مختلف بیماریوں کو جو ہمارے پراگندہ نفوس امارہ میں جاں گزیں ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾﴾ (آل عمران)

''تم پر تو ایک مصیبت آئی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آ گئی جبکہ تم دوگنی (اپنے دشمنوں کو) پہنچا چکے ہو۔(اے نبیؐ) کہہ دیجیے کہ یہ تمہارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔اللہ تعالیٰ تو بے شک ہر چیز پر قادر ہے۔''

(۲) دوسرا اشکال: خروج کی بجائے جمہوریت وغیرہ جیسے طریقے بہتر ہیں

دوسرا اشکال یہ پایا جاتا ہے کہ قوت کے ساتھ حکام کے خلاف نکل کھڑے ہونا اگرچہ وہ کافر و مرتد ہی ہوں' غیر متمدن اور غیر انسانی طریقہ ہے' جبکہ اس کے بالمقابل جمہوریت' انتخابات' ووٹنگ یا پر امن مظاہروں جیسے دیگر مہذب طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

جواب: یہ ہے وہ بات جسے ہم نے بہت سے دین کے ٹھیکیداروں سے سن رکھا ہے۔ اس باطل اشکال کا ہم درج ذیل نکات میں جواب دیں گے:

(ا) کیا شرعی طریقۂ کار اور خود ساختہ انسانی طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں؟: یہ ایک کفریہ اشکال ہے' کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ کفر و ارتداد کے خلاف نکل کھڑے ہونے کا شرعی طریقۂ کار جس کا اللہ نے حکم دیا ہے' وہ غیر مہذب اور بدتر ہے اور دیگر طریقے (جو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں) نہایت شائستہ' اعلیٰ اور نفع بخش ہیں۔ یہ بات اللہ ربّ کائنات پر طعن ہونے کے باعث عین کفر ہے اور مخلوق کے قوانین اور طریقہ ہائے زندگی کو اللہ ربّ العزت

کے قوانین پر فوقیت دینے کے مترادف ہے۔

(۲) اسلامی نظام ہی کفر یہ نظام کا بدل ہے: یہ انداز غیر واقعی اور تخیلاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی چیز کافر حکمران اور اس کے نظام کا بدل ہوسکتی ہے تو وہ اسلام ہی ہے' جبکہ دوسری جانب صورت حال یہ ہے کہ یہ کافر لوگ تو جنگ وجدل میں مسلمانوں کو اُن کے اسلامی اہداف اور لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کی طرف لے جانے والے مقاصد سے روکنے کے لیے مرجانا تک پسند کرتے ہیں اور اس کے لیے معیوب ترین اور حقیر ترین ہتھکنڈے بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔ اسی بات کو آیاتِ باری تعالیٰ یوں بیان کر رہی ہیں:

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾

(البقرۃ:۲۱۷)

''اور (یہ کافر تو) تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے جتنا بس چلے پھیر دیں''۔

نیز فرمایا:

﴿كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً﴾ (التوبۃ:۸)

''کیسا (ان کی طرف سے عہد) کہ اگر کبھی وہ تم پر غالب آ جائیں تو نہ تو قرابت داری کا خیال کریں گے اور نہ ہی وعدوں کا۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾

(البقرۃ:۱۲۰)

''یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز خوش نہیں ہو سکتے' یہاں تک کہ آپ ان کے دین کی پیروی کرنے لگیں''۔

یہ تو واضح مشاہدے کی بات ہے۔ اور ہاں' اگر آپ کے پاس کسی مسلمان ملک کی کوئی مثال ہے تو لائیے جس میں مسلمان ووٹنگ یا مذکورہ پیچیدہ طریقوں کے ذریعے حاکم ومحکوم کی سطح پر داخلی و خارجی سیاست میں اسلامی طرزِ حیات کے شروع کرنے کی ہی استطاعت رکھتے ہوں؟

کیا جمہوریت کھلی آمریت میں نہیں بدل چکی' اور اقوامِ متحدہ' بڑی بڑی ریاستوں اور ان کے عالمی ظلم کی 'برکتوں' سے ٹینک عام راہوں پر نہیں نکل آئے؟ یہ سب کچھ محض اس اندیشے کی بنا پر کیا گیا کہ کہیں اسلام حکومتی در و دیوار کے قریب نہ آ جائے۔

(۳) خروج فطری شے ہے: حکام کے خلاف قوت کے ساتھ بغاوت کرنا ایسی شے ہے جسے تمام اقوام وملل نے بھی اختیار کیا جب انہیں مٹھی بھر انقلابیوں کی طرف سے اپنی بنیادوں کو خطرہ محسوس ہوا یا تغیر وتبدل کا سامنا ہوا۔

ذرا تصور کیجیے کہ اگر امریکہ، برطانیہ، فرانس یا کسی بھی ملک میں چند عسکریت پسندوں کی جانب سے انقلاب برپا ہو جائے اور پھر وہ ان ممالک کی بنیادوں کو بدلنے پر مصر ہوں جن پر وہ قائم ہیں اور فی الوقت نہ تو دلیل کی بات سمجھیں اور نہ ہی عوام اور ووٹوں کی آواز سنیں، نہ تو کرسیٔ اقتدار چھوڑیں اور نہ ہی عوام کے لیے زندہ رہنے کے سوا کوئی اختیار —— تو ان ممالک میں کیا ہوگا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عوام آسانی سے ان چند مٹھی بھر لوگوں اور ان کی حکومت کو تسلیم کر لیں گے؟ یا پھر ان کے خلاف نکل کھڑے ہوں گے چاہے انہیں اسلحہ کا ہی استعمال کرنا پڑے؟

ان ممالک کے لوگوں کا اپنی بنیادوں اور اساس کی خاطر ان ظالموں کے خلاف اسلحہ کی قوت سے لبریز ہو کر نکلنا ایک بدیہی امر ہے، جب تک تمام معاملات اپنی صحیح سمت اور ڈگر پر لوٹ نہیں آتے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ان قوموں کے لیے جائز ہے اور ان کا بنیادی حق ہے تو ہم مسلمانوں کے لیے کس بنا پر حرام ہے؟ جبکہ ہمارے دین ووطن پر ظلم وزیادتی کی گئی اور ان بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا گیا جن پر کسی بھی قوم کی ترقی ووجود کا انحصار ہوتا ہے۔

آخر کس بنا پر یہ قومیں (خروج کا) حق رکھتی ہیں اور ساتھ ترقی یافتہ، شائستہ، محبِّ وطن، انسان دوست اور تمام تر تعریفوں کی آخری ڈگری پر بھی فائز ہیں؟ جبکہ مسلمان اس اسلوب (خروج) کو اپنائیں تو دہشت گرد، پسماندہ، انسان دشمن، غیر مہذب اور تمام تر طعن وتشنیع کی انتہا پر —— آخر کیوں؟؟

(جاری ہے)

حواشی

(۱) متفق علیه: صحیح البخاری: ٦٥٣٢۔ وصحیح مسلم: ٣٤٢٧۔

(۲) فتح الباری، جلد ۱۳، ص ۷۔

(۳) المنهاج شرح مسلم بن حجاج، ج ۱۲، ص ۲۲۹۔

(٤) صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب الانکار علی الامراء فیما یخالف الشرع

وترک......

(۵) صحیح مسلم : ۳۴۴۸۔

(٦) تفسیر فی ظلال القرآن، ج۳، ص ۱۵۴۳۔

(۷) قواعد الاحکام، ج۲، ص ۵۔

(۸) مجموع فتاویٰ ابن تیمیه، ج۲۸، ص ۲۵۹۔

(۹) اخرجه الطبرانی، السلسلة الصحیحة : ۴۵۷۔

(۱۰) اخرجه ابن حبان، السلسلة الصحیحة: ۳٦۰۔

(۱۱) سنن الترمذی : ۱۸۴۳۔

(۱۲) اخرجه الطبرانی، صحیح الجامع : ۳٦٦۱۔

(۱۳) اخرجه ابوداؤدو احمد وغیرهما، السلسلة الصحیحة : ۳۷۱۔

(۱۴) السلسلة الصحیحة :۲۹۸۸۔

(۱۵) اخرجه الطبرانی، السلسلة الصحیحة : ۲٦٦۳۔

(۱٦) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی النهی عن العینة۔

(۱۷) سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب کراهیة ترک الغزو۔

(۱۸) اخرجه ابوداؤد وغیره، السلسلة الصحیحة: ۹۵۸۔

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (46)

جبوتی

(DJibouti)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

جبوتی : ایک نظر میں

پورا نام: جمہوریۂ جبوتی
رقبہ: 23 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی: چار لاکھ 67 ہزار
اوسط عمر: 43 سال
سالانہ شرح پیدائش: 2.1 فی صد
گنجانی آبادی: 53 نفوس فی مربع میل
دارالحکومت: جبوتی (چار لاکھ)
زبانیں: فرانسیسی، عربی، صومالی، افار
نسلیں: صومالی 60 فیصد، افار 35 فیصد
مذاہب: مسلمان 94 فیصد، عیسائی 6 فیصد
شرح خواندگی: 67 فیصد
طرزِ حکومت: جمہوری
کل قومی پیداوار: 630 ملین ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: 1300 ڈالر
افراطِ زر: 2.5 فیصد
افرادی قوت: تقریباً تین لاکھ
قابلِ کاشت رقبہ: 0.04 فیصد
زراعت: پھل، سبزیاں، مویشی، اونٹ
صنعت: تعمیرات، زرعی پروسیسنگ

صنعتی شرح ترقی: 3 فیصد سالانہ
برآمدات: 155 ملین ڈالر (کھالیں، کافی)
درآمدات: 655 ملین ڈالر (غذا، مشروبات، ٹرانسپورٹ، کیمیکل، تیل)
تجارتی ساتھی: صومالیہ، سعودی عرب، یمن، ایتھوپیا، چین، فرانس، برطانیہ، امریکہ
بیرونی قرضہ: 370 ملین ڈالر
کرنسی: جبوتی فرانک
ٹیلی فون: بارہ ہزار
ریڈیو سٹیشن: اے ایم 1۔ ایف ایم 2
ٹی وی سٹیشن: ایک
ریلوے: 100 کلومیٹر
سڑکیں: 2890 کلومیٹر
بندرگاہ: جبوتی
بڑے شہر: جبوتی، تجورہ، الصبیح، دخیل
ہوائی اڈے: 13
کل فوج: 10 ہزار
سالانہ جنگی اخراجات: 26.5 ملین ڈالر
کاروں کی تعداد فی ہزار: 20

جبوتی مسلم اکثریت کا، مشرقی افریقہ کا ایک ملک بھی ہے، ایک شہر بھی اور بندرگاہ بھی۔ یہ چھوٹا سا افریقی ملک اسلامی سربراہی کانفرنس (او آئی سی) کا رکن ہے۔ جبوتی خلیج عدن پر واقع ایک قدرتی بندرگاہ ہے جس سے بحیرۂ قلزم اور نہر سویز کے راستے یورپی ممالک، بحیرۂ عرب اور بحر ہند کے راستے ایشیائی ممالک سے تجارت ہوتی ہے۔ جبوتی سے جھیل اصال 128 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ جھیل براعظم افریقہ کا سب سے نشیبی حصہ ہے۔ جبوتی کے مشرق میں آبنائے باب المندب

ہے۔ باقی تین جانب سے حبشہ اور صومالیہ نے گھیر رکھا ہے۔ 89 فیصد رقبہ صحرا پر مشتمل ہے۔ شمال میں واقع پہاڑوں سے ندیاں نکلتی ہیں جن سے آبپاشی ہوتی ہے۔ ملک کا قابل کاشت رقبہ ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

مختصر تاریخ

تیسری صدی قبل مسیح میں عبل (Able) نامی عرب قبائل یہاں آ کر آباد ہوئے۔ موجودہ افار قبائل انہی کی اولاد ہیں۔ بعد ازاں صومالیہ کے ایساس (Issas) قبائل افار کو جنوب سے دھکیل کر ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ اسلام یہاں 825ء میں مبلغین کے ذریعے پہنچ چکا تھا۔ یہاں کے لوگ شافعی عقائد کے پیروکار ہیں۔ سرکاری زبان عربی ہے۔ قاضی القضاۃ عربی الاصل ہوتا ہے جو وزارتِ مذہبی امور کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ تصوف میں جبوتی اور قادریہ سلسلے زیادہ مقبول ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے علاوہ بہت سے مقامی اور غیر مقامی اولیائے کرام کی تکریم و تعظیم کی جاتی ہے۔ یہاں کے چھوٹے چھوٹے قبیلوں نے اپنی اپنی مسجدوں کے نام اپنے اپنے بزرگوں کے نام سے موسوم کر رکھے ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی تک یہاں کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد پرتگالی تاجر بن کر آئے۔ عرب پرتگالیوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے تاجر تھے۔ اُن کے تجارتی کارواں تجورہ سے حبشہ کے بڑے بڑے شہروں تک آتے جاتے رہتے تھے۔ 1862ء میں فرانسیسیوں نے شہر اوبک پر قبضہ کیا۔ جبوتی کا علاقہ صومالی زبان بولنے والے ایک قبیلے عیسے کے مقامی سرداروں نے مارچ 1888ء میں فرانس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ موجودہ شہر جبوتی اور بندرگاہ فرانس ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کی بنیاد فرانسیسی گورنر لیون گاردے نے رکھی تھی۔ 1892ء میں یہ سابق فرانسیسی صومالی لینڈ کا دارالحکومت بنا۔ 1917ء میں ریلوے لائن کی تکمیل کے بعد یہ شہر حبشہ کے دارالحکومت عدیس بابا سے مل گیا۔ یہ ریلوے لائن 874 میل لمبی ہے۔ جبوتی ایک آزاد بندرگاہ ہے اور ملک کے لیے زرمبادلہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ نہر سویز کی بندش (1967ء تا 1975ء) سے تجارت اور معیشت کو بہت نقصان پہنچا۔ عدیس بابا کو ملانے والی ریلوے لائن بھی حبشہ کی خانہ جنگی سے اریٹیریا کے گوریلوں کی زد میں رہی۔ صومالیہ اور حبشہ میں جاری خانہ جنگی کی وجہ سے مہاجرین جبوتی کا رُخ کرتے ہیں، جن کی تعداد بسا اوقات مہاجر کیمپوں میں پچاس ہزار سے تجاوز کر جاتی ہے۔

1897ء۔ حبشہ سے معاہدہ ہوا، جس کے نتیجے میں جبوتی اپنے ایک علاقے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

1936ء۔ اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کیا تو جبوتی کی عسکری اہمیت بڑھ گئی۔ فرانسیسیوں نے یہاں بڑی بڑی چھاؤنیاں قائم کیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اری ٹیریا کی بندرگاہ عصب سے تمام تجارتی

روابط ٹوٹ گئے۔

1958ء۔فرانسیسی صومالی لینڈ فرانسیسی کامن ویلتھ میں رہتے ہوئے سمندر پار کا زیرحفاظت علاقہ بن جاتا ہے۔

1967ء۔27 جون کو آزادی کے حق میں کثرت رائے سے ووٹ پڑے تو آزاد اور خودمختار جمہوریہ جبوتی دنیا کے نقشے پر ابھرتی ہے۔وزیراعظم احمد دینی اور سیاسی رہنماؤں میں اختلافات کے باعث استعفادے دیتے ہیں۔

1970ء کے عشرے میں صومالیوں کا سیاسی اثر و رسوخ کافی بڑھ گیا۔ وہ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے یہاں مستقلاً آباد ہو گئے تھے۔انہوں نے فرانس کو آزادی کے لیے مجبور کیا۔

1977ء۔27 جون کو فرانس کے زیر قبضہ علاقہ ''جمہوریہ جبوتی'' کے نام سے آزاد مملکت بن گیا۔

1978ء۔عبداللہ محمد کامل کو فروری میں وزیراعظم مقرر کیا جاتا ہے۔ستمبر میں اُن کی برطرفی پر برکات حمدۂ یہ عہدہ سنبھالتے ہیں۔

1981ء۔ فروری میں آئین بنا۔طرزِحکومت صدارتی ہے۔صدر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر چھ سال کے لیے منتخب ہوتا ہے۔صدر دو بار سے زیادہ منتخب نہیں ہوسکتا۔

1987ء۔فرانس کے صدر متراں نے یہاں کا دورہ کیا۔آزادی کے بعد فرانس کے صدر کا یہ پہلا دورہ تھا۔جولائی 1988ء میں فرانس نے پرانے میراج طیاروں کی جگہ جدید ایف ون ایس میراج طیارے یہاں بھیجے جو جنوبی یمن اور حبشہ کے مگ طیاروں کا بخوبی سامنا کر سکتے تھے۔اسی سال امریکہ نے اپنی سریع الحرکت فوج (آر ڈی ایف) کے لیے بندرگاہ کی سہولت مانگی جسے جبوتی نے ردّ کر دیا۔

1992ء۔4 ستمبر کو نئے آئین سے متعلق ریفرنڈم کرایا گیا' جس میں کثیر جماعتی سیاسی نظام کے متعلق عوامی رائے طلب کی گئی تھی۔عوام نے اُس کے حق میں بھاری اکثریت سے ووٹ دیے۔

1999ء۔حسن گولڈ جو آزادی کے بعد سے صدر چلے آ رہے تھے' مستعفی ہو گئے۔ان کی جگہ اسماعیل عمر صدر منتخب ہوئے جو آج تک اس منصب پر فائز ہیں۔

2000ء۔جبوتی حکومت اور افار قبائل کے مابین معاہدۂ امن ہوا۔ یوں برسوں سے جاری خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا۔

2002ء۔امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف اپنی عالمی تحریک شروع کی تو جبوتی اس کی افواج کے لیے ایک اہم عسکری اڈا بن گیا' جس کے بدلے اسے معاشی امداد ملتی ہے۔